

بلاول کے کچے

صدیوں کی مسافت طے کر کے آئی ہوں۔ میرا انگ
انگ ٹھکن زدہ تھا۔ آنکھیں گویا رو کر کر تھک چکی
تھیں۔

میں بھلا کس کا گریبان پکڑتی، کسے مجرم ٹھہراتی۔
میری بات پر بھلا کس نے ایمان لانا تھا۔ میں ماما کو کچھ
بتاتی تو نہیں پالتی تھی۔ بھلا بتاتی بھی کیا؟ یہ میرا اپنا ہی تو
فیصلہ تھا۔ ماما نے مجھے کس قدر سمجھایا تھا مگر میں اپنی
سادگی میں کچھ سمجھ ہی نہیں پالتی۔

مجھے چہرے دھونے کا دعوا تو بھی نہیں رہا تھا مگر میں
حیران تھی کہ بعض لوگ کس طرح صورت بدل
کر سامنے آتے ہیں۔ ہر دفعہ ان کا نیا چہرہ نظر آتا تھا۔

پا ہر چمکتی دھوپ کا راج تھا۔ گرم لوکے تھپیڑوں
نے گویا ہر شے کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے کھڑکی
کے پردے ہٹا کر باہر دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا میرا دل
سینہ توڑ کر گرم اور جھلسا دینے والی زمین سے لپٹ پٹ
کر مین کر رہا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ماما مجھے بہت سمجھاتی، بھاتی رہی
تھیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، آثار چڑھاؤ۔ مگر میں
انہیں بھلا کیا بتاتی۔ میرا دل تو آتش کدہ بنا ہوا تھا۔ میں
مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنادی گئی تھی۔ میرے
لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا خود نشی کے برابر تھا۔
آج آٹھواں دن تھا اور مجھے لگتا تھا گویا میں

مکہ مکرمہ



ایسا چہرہ جو کسی بھی سادہ دل رکھنے والے کو دھوکے میں جتا کر سکتا تھا۔

میری سادگی میرے لیے ہمیشہ نقصان کا باعث بنی تھی مگر اس دلہ تو میرے دل کا نقصان ہو گیا تھا، یوں لگتا تھا گویا کسی نے میرا دل فوج کر کے پتھر کے ٹپچے رکھ کر پھیل دیا ہے۔

مجھے اس سے بے تحاشا محبت جو ہو گئی تھی اور میں نے کبھی سوچائی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے بھی اس طرح کسی اور کی جیسی داستان سن کر بدگمان ہو جائے گا۔ اس کی بدگمانی کے کھاتے میرے دل میں نیزے اتار دیے تھے۔

مگر میرے ساتھ بھلا ہوا کیا تھا ؟



ان دنوں میرے ستارے گردش میں تھے۔ نہ جانے کس منہوس گھڑی میں وہ دم سے ڈپٹ پڑا فون خود بخود ٹھیک ہو گیا تھا اور ممانک یہ منہوس خبر بغیر کسی دشواری کے پہنچ چکی تھی۔ سدا کی کہنی فسادوں اور ہلاکی کم ظرف غائبی کے جگہ پیٹ میں میرے یعنی ساجیہ مراد کے متعلق ”خبر“ بھلا کیسے ٹھہر سکتی تھی مہمانوں کو فون کھڑکا کر میری شان دار کالیالی کی اطلاع پہنچا دی تھی۔

”خدا! ساسی میٹرک میں بیٹ ٹرک مار چکی ہے۔ اس مرتبہ بھی سابقہ ریکارڈ قائم رکھا ہے محترمہ خیر سے صرف تین مضمون کلینئر کر چکی ہیں۔ باقی سب میں گول انڈا لگتا ہے پرچوں میں نہاری“ جیسی ”اور گلاب جاسن کی ترکیب لکھ کر آئی تھی۔“

فون تو بند ہو چکا تھا اور مہمان جو تے سے میری دھنائی کرنے کے بعد صوفے پر بیٹھی ہانپ رہی تھیں۔ غم دھیسے سے ان کا سرخ و سفید چہرہ چمٹا رہا تھا۔ سبز آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ یونیورسٹی کی پوزیشن ہولڈر میری پیاری ماما کا حد سے مارے برا حال تھا۔

”بے شرم! چلو بھائی میں ڈوب مو۔ انیس سال کی ہو چکی ہو۔ ابھی تک میٹرک میں انکی ہو۔

تمہارے ساتھ کی گریجویشن اور ماسٹرز کر کے دو دو پیچے بھی کھلا رہی ہیں۔“

”آپ کی سستی کی وجہ سے لیٹ ہو رہی ہوں۔ ورنہ اس وقت آپ بھی ٹائون چکی ہوتیں۔“ میں نے افسوس کے عالم میں ماما کو گزرتے وقت کا احساس دلانا چاہا تھا۔ ماما جلدی کر دو سرا ہونا انارنے لگیں۔

”سوری ماما!“ میں فوراً ”صوفے کی اوٹ میں کشن اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ماما میری بے حیائی کے اس عظیم مظاہرے کو ملاحظہ کرنے کے بعد نہ جانے کس سوچ میں گم ہو چکی تھیں۔

میری نظریں ماما کے خالی پیروں پر تھیں۔ سو میں اطمینان سے صوفے پر ڈھسے لگی۔ عام حالات میں وہ

جو تے کے ساتھ پیشین لگانا نیزے کے خلاف سمجھتی تھیں۔ عام حالات میں تو محض مجھے گھوریوں سے ہی ڈرا دیا جاتا تھا۔ اور ماما کی گھوریوں کا اثر ہی اس قدر ہوتا تھا کہ میں فوراً ”ہی“ اس بانٹ ہو جاتی۔ اگرچہ ماما کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ میری جو تے کے ساتھ دھنائی کریں مگر خیر سے ”معاذ!“ ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ بھی کہاں تک ضبط کر تیں۔

میٹرک میں مجھے تیسرا سال لگ چکا تھا۔ میری کلاس فیلوز اور کزنز نو مجھ سے کہیں آگے نکل چکی تھیں، مگر میں اپنے کند ذہن کو بھلا کہاں سے پالش کرائی اور پھر سائنس دانوں کی ”یکواس“ میرے دماغ میں ساسی ہی نہیں تھی۔ نہ جانے کتنے ہی ٹیوٹر میری بالائقی سے گھبرا کر دوسرے ہی دن بھاگ گئے تھے۔ مجھ جیسی کند ذہن ”بلا لقی“ کو ٹیوٹر مقرر کے ساتھ بھلا دماغ کھانے کی ضرورت ہی کیا تھی، جسے طبیعات کے تعارف کی الف ب بھی نہیں آتی تھی۔

باقی مضامین میں بھی میری دلچسپی ایویں سی تھی۔ ریاضی کو دیکھ کر تو مجھ پر زلزلہ طاری ہو جاتا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں ہی کوئی چار پانچ ماہ پہلے فزکس کی تیاری کرواتے ہوئے ”میری جان سے پیاری غائبی نے اچانک میری ذہانت کو جاپٹے اور جو کچھ پڑھایا تھا اس کا نیٹ لینے کی غرض سے یو چھلا۔

”ساسی! دس منٹ کے اندر اندر جواب دیتی چاہتا“ آج جنہیں پڑھا کر میں نے اسو کی طرف جانا ہے۔ وہ میرے لیے گاڈا اور چیخوف کی کتابیں لے کر آیا ہے۔ اور میں وہ کتابیں پڑھنے کے لیے تخت بے چین ہو رہی ہوں۔“

غالی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ ان فضول کتابوں کے نام لے کر گویا پوری پوری اور خطائی کا ڈال تھا اس کے منہ میں گھل گیا تھا۔ میرے منہ کے زاویے اسو کا نام سن کر ہی ”خٹے“ بگڑنے لگے تھے۔ منہ میں گویا کروڑے بادام آگئے۔ حالانکہ یہ چاکلیشی ہیرو جیسا کزن فریڈز کے درمیان گردن اگڑانے اور دوستوں کے درمیان ویلیو بنانے کا سبب تھا۔

”چھوڑو بھی غالی! جس راسخ کا نام ہی اتنا خوف زدہ کروینے والا ہو۔ اس کی تعریف کتنی بکواس ہوگی۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا چیخوف۔ یعنی تراخوف ہی خوف۔ اور یہ فرانز کا نکلا۔ ایسے لگتا ہے جیسے راز اور کانے یعنی فورک کا ڈر کیا جا رہا ہے۔ ہائے غالی! مجھے تو بھوک بھی لگ گئی ہے۔“ میں نے پیٹ پکڑ کر دہائی دی تو غالی نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میرے سر پر دے ماری۔

”بھوسا بھرا ہوا ہے ریل۔“ کتاب کے وزن سے میرے دماغ کی چولیس مل کر رہ گئی تھیں۔ اوپر سے غائبی کا موڈ بگڑ گیا تھا۔

”جیمس ٹھیک ہی پاور چن“ دھون اور درزن کا خطاب دیا گیا ہے۔ تمہارا دماغ پڑھنے کی طرف نہیں مائل ہونے والا۔ پکڑے اور کھانے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔ کھا کھا کر ایک دن غبارے کی طرح پھٹ جاؤگی۔ مونٹی!“ غالی میری اچھی صحت پر جوت کرنے سے باز نہیں آتی تھی اور کھانا پکانے کے کھینے دیتا تو ماما اور ان کی پیاری بھانجی غالی کلورینہ مشغلہ تھا۔ میں نے تو اکثر ہی ماؤں کو آجیں بھرتے دیکھا ہے کہ ان کی بیٹیاں چن کے نام سے ہی دور بھاگتی ہیں۔ سینے پر دے کا بھی کوئی شوق نہیں ہوتا۔ گھر کے کالم کالج سے

الریک ہوئی ہیں جبکہ مجھ میں سکھو خواتین والے سارے جراثیم پائے جاتے تھے۔ مگر میرے ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کر ممانک اتنی اٹھتی تھیں۔

”بھئی اسی شوق اور جذبے سے کتب بھی پکڑ لیا کرو۔“ یہ طعنہ تو ماما کی نوک زبانی ہر وقت چھتا رہتا تھا۔ نہ جانے ماما کی کیسی ہل تھیں۔ یعنی میں جو ایک شرا میڈ کی خدمات سر انجام دیتی تھی۔ ان کی ماما کے نزدیک ساس کی کوئی ویلیو نہیں تھی۔

”ساجیہ مراد! میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ علم موسیقی اور آواز پر سائنسی دریافتیں کرنے والے سائنس دان کا نام بتاؤ جو کہ تیسری صدی ہجری میں بصر میں پیدا ہوا تھا۔“ مجھے سوچوں میں الجھا دیکھ کر غالی نے کافی ناراضی کے عالم میں اپنا سوال دہرایا۔

”تیسری صدی ہجری میں کون پیدا ہوا تھا؟“ میں نے یادداشت کے سارے خاتے کھنگالنے شروع کر دیے تھے۔

”کون سی ایسی کہانی والی چیز کے نام سے ملتا جلتا نام تھا۔ علم موسیقی کو دریافت کرنے والے سائنس دان کا۔“ میں زیر لب بڑبڑاتے ہوئے سخت ٹینشن میں جھلا ہو چکی تھی۔

”ساسی! غالی کے ضبط کا پتا نہ لہرز ہو گیا تھا اور میرے منہ سے اچانک لغتہ برآمد ہوا۔ ”شکر قدی“ یعنی الکندی۔“

”بھائو میں جاؤ تم۔ ایک سوال کے جواب میں چندہ منٹ بھر کر دیے ہیں۔ پیچھے میں نہ جانے تم کیا کرو گی۔“ غالی درست جواب سن کر مجھ میں بھلائے بیٹھی رہی۔

”سوری غالی!“ میں نے بھی لفظی تسلیم کر کے معافی مانگنے میں دیر نہیں کی تھی۔

”آخری جواب بتاؤ“ پھر جان چھوٹ جائے گی تمہاری۔ ویسے بھی ”گھر“ لگنے والا ہے۔ غالی میری دلی کیفیات سے واقف تھی۔ تب ہی تو میرے فیورٹ ڈرامے گاڈ کر گیا تھا۔

”پوچھو“ میں نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔
”حالت سکون سے چلنے والی کاری ابتدائی ولاشی
کتنی ہوتی ہے؟“

”یہ ولاشی صفر ہوتی ہے۔“ میں نے بھی نظر بچا کر
کتاب میں سے ایک کروٹ کھلا اور بحث سے جواب
بھی دے دیا تھا۔ غالی کون سامیری طرف متوجہ تھی۔
اپنا ہنڈ بیگ کھولے بل کا پیکٹ نکال رہی تھی۔ سو
میرا بھی کلام چل گیا اور آج ان ہی چھوٹی مٹی
”چوڑوں“ کا خمیازہ کھل ہونے کی صورت میں بھگت
رہی تھی۔

ممانے کافی سوچ بچار کرنے کے بعد سر اٹھا کر میری
طرف دیکھا تھا اور پھر بولیں۔
”ساجہ! اتنا ہی سمیٹ کر نیچے آجاؤ۔ میں تمہاری
پیکنگ کرنے لگی ہوں۔“

”مگر کیوں ممانے؟“ میں حیران پریشان ہی تو رہ گئی تھی۔
”تم نبیلہ کے پاس جا رہی ہو۔“ انہوں نے فیصلہ
کن انداز میں کہا۔

”پوچھو کے پاس جھڑکیوں؟“ نبی بظہر چپ پوچھو
کے پاس جانے کے متعلق سوچ کر ہی میں گرا زخمی
تھی۔

”اس لیے کہ لاتوں کے بھوت پاؤں سے نہیں
مانتے۔“
”مما پلیز!“ میں منمناتی رہ گئی تھی۔



”ڈیڈی! مجھے اسلام آبلو بھجوانے لگی ہیں۔“
ڈاکٹر ملک روم میں گھستے ہی میں نے دہائی دینا شروع کر دی
تھی۔ تلکی امی یعنی بڑی ماما اور ڈیڈی (نمایا ابو) آدھا
گھنٹہ پہلے ہی گھر آئے تھے۔ دونوں عدا بھائی کے بیٹے
کو دیکھنے کراچی گئے ہوئے تھے۔ عدا بھائی ڈیڈی کے
اکھوتے بیٹے تھے اور میں اپنے پاپا اور ماما کی اکھوتی بیٹی۔
بس یہی ہمارا مختصر سا خاندان تھا۔

عدا بھائی مجھ سے چندہ سال بڑے تھے۔ ان کی
شادی کو نو سال ہونے والے تھے اور ان کے ہاں

تیسرے بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ بلا
بعد بڑی ماما اور ان کی واپسی آج ہی ہوئی تھی۔ اور
میرے ٹیل ہو جانے والے کارٹاس کے متعلق بھی
انہیں بتا چل چکا تھا۔

”سازہ! ہماری بیٹی کو اتنی دور مت بھجواؤ۔ بھلا اس
چمکتی مینا کے بغیر ہم بچائیں گے۔“ ڈیڈی فوراً جذباتی
ہو گئے تھے۔

”بھائی جان! اس بلائق کو نبیلہ ہی سدھار سکتی
ہے۔ شاید میٹرک میں پاس ہو ہی جائے۔“ ماما بھی
جذباتی ہو گئی تھیں اور مجھے بھی کروا تھا۔

”مجھے آئرس پڑھنے دیتیں تو یہ دن دیکھنا نہ پڑے۔“
”زبان بست چلتی ہے تمہاری۔“ دماغ کو بھی کبھی
زحمت دے لیا کرو۔ ”مما کو میرا رچ میں بولانا قطعاً
نہیں بھلایا تھا۔

”سازہ! ساتھی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بچے کا شوق اور
دلچسپی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ ہیشہ کی طرح پپا اور
ڈیڈی میری حمایت میں بولے تھے۔

”تپ کی ان ہی باتوں نے اس کا دماغ خراب کر
رکھا ہے۔“ ماما کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ میں نے ہمیشہ
برائی اور تکہ بونی سے خوب انصاف کیا اور دعا پڑھ کر
اپنے کمرے میں چلی آئی۔

صبح ہر صورت مجھے اسلام آبلو جانا تھا اور آج کی
رات میں جی بھر کر سونا چاہتی تھی۔ بد قسمتی سے میں
مما اور پاپا کی اکھوتی اولاد تھی۔ اگر ان کے اور بھی تین
چار بچے ہوتے تو شاید ماما کی توجہ بٹ جاتی۔ مگر ہمارے
خاندان میں بچوں کا فقدان تھا بلکہ قطعاً کمنا مناسب
ہو گا۔

اللہ بخشے داوی مرحوم جب زندہ تھیں تو ماما اور
بڑی ماما کی ہر وقت شامت آتی رہتی تھی۔ انہیں اس
پات کا بہت قلق تھا کہ ان کی اولاد کی بہت کم اولاد ہے۔
بڑی ماما ایک بیٹے کی ماں تھیں۔ اسی لیے ان کی دلچسپی
بچت ہو جاتی تھی۔ البتہ میری ماما تو داوی کا اکھوت چھتر
عذاب نازل ہو مارتا تھا۔

”سازہ! اس “شینی“ کو پیداکر کے گویا کے ٹوکا
پھاڑ کر لیا ہے۔“ داوی بھی میری اچھی صحت سے
خاصا جانتی تھیں۔ یہی حال نبیلہ پوچھو کا تھا۔
”دماغ کو زحمت جو نہیں دیتی۔ اسی لیے گوشت
کا پھاڑ بنتی جا رہی ہے۔“

انہوں نے میرے بھرے بھرے سڈول سر اے کو
گوشت کے پھاڑ سے تشبیہ دے کر میرے نازک
جذبات کو بری طرح سے مجروح کروا تھا۔ اپنی تو صرف
دو ہی تختی سی تاؤ کی طرح تھی۔ سو بھی پائس جیسی دو
پیشیاں تھیں اور ڈگریاں میرے حصے کی بھی انہیں کر
رہی تھیں۔ اس طرح کے رویوں کی میں بچپن سے
ہی عادی تھی۔ میری صحت اور تعلیم یہ دو ایسے مسئلے
تھے جو میرے خاندان والوں کے لیے مسئلہ قلعہ بن
چکے تھے۔ نہ تو میں ماما داوی اور پوچھو کی خواہش کے
مطابق اپنی صحت ڈائننگ کے شوق میں تباہ کر سکتی
تھی اور نہ ہی میٹرک میں مجھ سے پاس ہوا جا رہا تھا۔ یہ

دونوں کام یوں لگتا تھا جیسے میرے اختیار سے باہر ہیں۔
کھانا پینا چھوڑ کر میں کیسے ٹی بی کی مریض بن سکتی
تھی؟

”سو کھی سڑی ہڈیوں کی ڈھانچہ سی ساجہ مراد بھلا
کیسی لگتی؟“ یہ سوچتی تھی۔ مجھ پر کچھ طاری کر رہی تھی۔
سو میں ڈٹ کر تینوں وقت کا کھانا کھاتی تھی۔ ماما کی
گھوڑوں کی پرواہ کیے بغیر۔ اور رہا دعائی کا مسئلہ۔ تو
شاید کسی نہ کسی طرح میرا میٹرک میں اے پس آجاتا
اگر مجھے آئرس پڑھنے دیتیں۔ شاید اس وقت میں
اردو ادب یا فائن آرٹ میں اپنا نام بنا چکی ہوتی۔ مگر
ہائے میری قسمت! مجھے تو ابھی تک بہتی کرنٹ اور
مقتناطہ سیت کے درمیان غفلت کو معلوم کرنے والے
کا نہیں بتا تھا کہ وہ فلیمنگ ہے نیوٹن ہے فیزاؤلے
ہے یا پھر اور مڈل ہے۔

اپنی تازہ ترین بے عزتی پر میں جی بھر کے تھلا
رہی تھی۔ اس تھلاہٹ نے تو زندگی بھر میرے ساتھ
ی رہنا تھا اور اب جو نبیلہ پوچھو کے پاس بھیج کر مجھ

بے چاری پر قلم کے پھاڑ توڑے جا رہے تھے مگر بھلا
ہو میرے چارے ڈیڈی کا۔ انہوں نے صبح صبح ناشتے
کی میز پر ایک جذباتی تقریر کر کے ماما کے ارادوں کو
ڈالوں ڈول کر دیا تھا۔ تب ہی تو ممانے شمو کو میری
پیکنگ کھولنے کا آرڈر دے کر گھستے حد سے زیادہ مسرور
اور شلو کر دیا تھا۔

ڈیڈی کی بے پایاں محبت پر پہلے بھی مجھے شک
نہیں تھا مگر اب تو اس محبت پر گویا مہر لگ چکی تھی اور
اوجھڑیڈی میرے کپڑوں میں کہہ رہے تھے۔

”ان دونوں خواتین کے ہاتھ سے بے بد مذاکھانے
کھا کر ہم نے بھلا مرنا تھا کیا؟“ مجھے اپنی بیٹی کے ہاتھ سے
بنی کٹنی پہے بغیر نیند بھلا آ سکتی تھی؟
”مگر ڈیڈی! یہ فرس اور فیکسوری۔“ میں رو دینے کو
تھی۔

”ارے! چولے میں جو کچھ فرس کو۔ کوئی
ضرورت نہیں! تنگی سی جان کو غم لگانے کی۔ اگلے
سال آرام سے بیچ دے لیو۔“

پاپا نے لاہر والی سے میرے شانے چھینے سائے
ایسے ہی تو میں اپنے پاپا اور ڈیڈی کے گیت فیس گاتی
تھی۔ انہوں نے بھی مجھے پاپس ہونے نہیں دیا تھا۔
ان کی ایسی ہی محبت کی وجہ سے میں ابھی تک میٹرک
میں انہی ہوئی تھی۔ دراصل رزلٹ آنے کے بعد ماما
مار کٹائی کا پیڑ لگتی تھیں۔ اور پھر میں تین چار گھنٹے
سوگ کی کیفیت میں گزار دیتی تھی پھر میری سوچی سوچی
آنکھیں کچھ کر ڈیڈی اور پاپا جی جان سے میری بہت
بندھاتے تھے۔ ان سے میری ایڈیٹوریہ رائے جیسی
مونی مونی آنکھوں میں آنسو جو نہیں دیکھے جاتے تھے۔
”ساتھی! انیشن! نہیں لیتا بیٹا!“ کرتے ہیں شہسوار
ہی میدان جنگ میں۔“ تم ایک دفعہ پھر کو خوش کرو“
محنت کرو۔“ یہ ڈیڈی کے الفاظ ہوا کرتے تھے اور ماما
سچا ہو جاتیں۔

”بھائی جان! آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں! یہاں
ٹینڈر! لی نہیں دی جاتی ہے۔“

”اگر یہ ٹینشن کتنی تو اس کا طول اور عرض اتنا پھیلا ہوا نہ ہوگا۔“ اسود بھائی بھی میری ”صحبت“ کے دشمنوں میں سے تھے۔

”ہونہ“ خود بڑے اسرارٹ ہیں۔“ میں نے ناک چڑھائی۔

”بک بک سن لو بس۔“ ممانے سے بولیں۔ ”چاؤ“ اسود کے لیے چائے بنا لاؤ۔“

”کلام کے وقت ساجیہ یاد آجاتی ہے۔“ میں کہنے سے باز نہیں آئی۔ ”فری سے کہیں نہ چائے بنالائے۔“ میں نے شان بے نیازی سے کہا۔

”مجھے جو شانہ نہیں پتا۔“ اسود بھائی نے ناگواری سے کہا۔ ”ساتھی کے علاوہ کوئی اچھی چائے بنانی نہیں سکتا۔“ اب وہ میری تعریف کر رہے تھے۔ جسے میں سراسر خوشامد سمجھ رہی تھی۔

”مسک مت لگائیں۔“

”یہ مسک کیا ہوتا ہے؟“ وہ حیران ہوئے۔ ”اک بات تو ج ہے۔ میری بہن سے اپنی کوئی چائے بنانی نہیں سکتا۔“

”بہن۔“ صدے کی شدت سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ نچلے ہر خوبصورت اور قابل لڑکے کو میں بہن ہی کیوں لگتی تھی۔

اگر شادی ہو جاتی تو کم از کم پڑھنا تو نہ پڑتا۔ اور میں واحد ایسی لڑکی تھی جو اپنے لیے بھرے بے کھانے پینے کے شوقین سسرال کی دعائیں مانگتی تھی۔ جنہیں کھانے کھنا کر میں اپنا گرویدہ بناتی اور کم از کم وہ مجھ سے میری ڈگریوں کے بارے میں بحث نہ پوچھتے۔

ممانے نزدیک میں ساری دنیا کی لڑکیوں سے زیادہ بلا لائق، جاہل اور کندہ بہن تھی۔ مگر دل میں وہ میرے ٹھیکوڑاپے کی قابل ضرور تھیں۔ میں ہر فن میں طاق تھی اور میرے ٹھیکوڑاپے کا سارا کریڈٹ بڑی ماما کا تھا۔ انہوں نے مجھے کونگ سے لے کر سلائی کڑھائی تک ہر فن میں طاق کر دیا تھا۔ مگر ممانے نزدیک میری ان خوبیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ

”ویٹے لوگوں کے سپاہے“ کہہ کر میری ان خوبیوں کو مٹی میں بدل دیتی تھیں۔

”ساتھی! ایک تو تم بھانے کس مراقبے میں چلی جاتی ہو۔“ ممانے فحشگی سے کہا ”اب اٹھو بھی چکو۔“

”جاری ہوں۔“ میں دھپ دھپ کرتی پکن میں چلی گئی۔



میں بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ فٹ کری بنا رہی تھی۔ پھلی کو مین لگا کر پہلے سے رکھ دیا تھا۔ پیاز بھی گولڈن کر لی تھی۔ فٹ بھی فرانی ہو چکی تھی۔ بس تو مجھے کھانے کا کلام تھا۔ ساتھ ساتھ اٹالین سلاڈ کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ یہ مینو ڈیٹی کی پسند کے مطابق صبح ہی میں نے ترتیب دیا تھا۔ کوفہ بریانی دم پر تھی۔ اسی مل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں وقتاً فوقتاً سلیپ پر رکتے فون پر بھی نگاہ ڈال رہی تھی۔

”فون! اب فون سننے لاؤ جس جاؤں۔“ میں نے بھنا کر سوچا۔ فون بے چارہ بچ کر خاموش ہو گیا تھا۔ تب ہی ماما اور بڑی ممانے تک روم سے پر آمد ہوئیں۔ نچلے فون کی مینٹنگ کر کے فارغ ہوئی تھیں۔

”کس کا فون تھا ساتھی!“

”ابن ابیہم کا ہوگا۔“ میں نے رونا لگاتے ہوئے سلاڈ کے لیے خربوزہ کاٹنا شروع کر دیا۔

”ہیں۔ وہ کون ہے؟“ بڑی ممانے حد حیران ہوئیں۔ فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی تھی۔ بڑی ماما ابن ابیہم کے متعلق تفصیل پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئیں۔ کچھ دیر بعد مجھے بڑی ماما کی افسردہ سی آواز سنائی دی۔

”کچھ دیر بعد آئیں گے۔ کسی کھریلو پر اہلم کی وہ۔“

”اس کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے۔“ ماما کی گفتگو اور شدید پریشانی میں ڈوبی آواز سنائی دی تو میں نے چونک کر ان دونوں خواتین کے منتظر چہروں کی طرف دیکھا۔

کس کے نصیب ٹھنڈے ہیں۔ یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ ماما کا اشارہ یقیناً ”میری ذات گرامی کی طرف تھا۔ شاید کچھ مہمانوں کو اتنا تھا اور اب ان کا پروگرام بدل گیا تھا۔ یقیناً“ انہیں بھی میرے مونڈاپے کی بھنگ پڑ چکی ہوگی۔ ایسا ایک دو مرتبہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

میری ذات کے ساتھ بے شمار مسائل کا انبار بھی جڑا ہوا تھا۔ ایک تو میری نانا لکھی دو سرا میرا پھیلا ہوا وجود۔ تیسری یہ گز بھر لمبی زبان بھونٹنے سے مہمانوں کو دیکھ کر منہ کے اندر رکھتی ہی نہیں تھی۔ کبکنت تیز گام کی طرح چلتی جاتی تھی۔

پچھلے دنوں کچھ خواتین آئی تھیں۔ میرے گورے بٹے خوب بھرے بھرے سراپے کو کھانے والی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ بعد میں کھلا بھیجا ”انہیں آنے کی پوری نہیں چاہیے۔ بس مجھے بھی قصہ آگیا۔ بڑی ماما کی رسل ڈائری میں سے ان خواتین کا فون نمبر چرا کر وہ کتے لیے کے یاد دی کرتی رہیں کی تمام عمر اس شاندار بے عزتی کو۔ ساجیہ مرادو کو آنے کی پوری کہنے کا شہانہ بھگتنا تو تھا ہی۔ میں نے بھی ان کے گتے بیٹے کی شان میں ایسے ایسے القابات کہے تھے کہ بے چاری تمام عمر جاتی تھکتی رہیں گی۔

یہ دو سری محسوس ترین ٹیلی فون کل تھی۔ دو میری زندگی میں بھونچال لانے کا باعث بنی۔

ماما کی پریشانی نے مجھے بھی بچ بچ پریشانی کر دیا تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ماما کو ان دنوں مجھے پڑھائی کی افادیت پر لمبے گے لکچر دینے کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ دو سرا حیرت کا بھونچا مجھے تک دیا۔ جب آؤں گی کتابیں میری رائٹنگ ٹیبل پر بچ گئیں۔ ممانے اپنی ضد چھوڑ دی تھی۔ ان دنوں کے سرے سے مجھے ڈیڑھ سارا پڑھانے کا بصورت اتڑ چکا تھا۔ اب وہ مجھے سلم اینڈ اسارٹ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے سلسلنگ سیٹفر کی میڈیم سے بات بھی کر لی تھی۔

اگر میرے پکن میں کھنے پر شدید مابندی لگ چکی

تھی۔ میں اپنے پسندیدہ سبجیکٹ دیکھ کر اس قدر خوش نہیں ہوتی تھی جس قدر پکن میں کھنے پر مابندی نے مجھے اُدھ مودا کیا تھا۔ ممانے صبح صبح پانچ کا پڑھائی پلا کر دیے کی ایک چھوٹی سی پیانی پکڑا دیتی تھیں۔ تین دن اس ناانسانی اور ظلم کے بعد میں نے اپنے زرخیز دل سے کچھ نئی ترکیبیں نکال لی تھیں۔ کبھی ڈیٹی اور کبھی پلاٹ سے دو تین سو روپے لینا میرا معمول بن گیا تھا۔ کیونکہ ماما اور بڑی ممانے مجھے دہلا کرنے کے لیے جو عہد کر رکھا تھا۔ اس عہد کو د نظر رکھ کر میری پاکٹ مٹی بھی بند ہو چکی تھی۔

اب ممانے پڑھائی پر نہیں بلکہ ڈانٹننگ پر بڑے بڑے اور بے لگجڑوتی تھیں۔

ان دنوں ماما سب سے بڑی ٹینشن میرا برہم تھا ہوا وزن تھا۔

جس دن میرا میٹرک کا شاندار رزلٹ آیا یہ اسی دن کی بات ہے۔ یہ دن میرے لیے خوشگوار نہیں تھا۔ حالانکہ ماما اور بڑی ممانے پھولے پھولے گلابی چہرے پر نہ چلنے تھے ہی بوسے دے چکی تھیں۔ ماما میرے اچھے رزلٹ پر پھولے نہیں ساری تھیں۔ اور ڈیٹی فخریہ کہہ رہے تھے۔

”میں نہ کتنا تھا سارا ساتھی کو آؤں پڑھنے دو“ بچے کی دلچسپی اور شوق کو اذیت دینا چاہیے۔ ”مما آج ڈیٹی سے متعلق ہو چکی تھیں۔ انہوں نے کسی بھی قسم کی بحث نہیں کی تھی۔

رات کو خالہ نے ماما کو فون کر کے بتایا۔

”آپا! بڑی آپا نے اسود کے لیے غائبہ کو مانگا ہے۔“ اس خبر نے ممانے چہرے کے سارے رنگ اڑا دیے تھے۔ شاید وہ بھی اسود بھائی کو بطور دلاو پسند کر چکی تھیں۔ تاہم بھائی کی خوشی پر انہوں نے کم حرفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ پہلے چھوٹی خالہ کو اور پھر بڑی خالہ کو مبارکباد دی۔

اگر میرے ارمانوں پر بھی اوس پڑ چکی تھی۔ غلطی اور اسود بھائی سے اچھے اچھے گفتگو وصول کر کے

میں نے بھی اوپر ہی دل سے انہیں مبارکباد دی۔ اگر اسو بھائی کے ساتھ بات بن جاتی تو میں نے ایف اے کے بجائے شادی کرنا تھی۔ مگر بوائے میرے نصیب جو بھول ماما کے بالکل برف یا آئس کریم کی طرح ٹھنڈے تھے۔

خاندان کے سارے ہی لڑکے ایک ایک کر کے کھوئے۔ سب بڑھ چکے تھے۔ حنا اور صبا جیسی ٹالا ٹٹ لڑکیاں بھی دو دو بچوں کی اماں بن چکی تھیں۔ میرا دل جل جل کر خاک ہو رہا تھا۔ اور ادھر اسو بھائی اور غالی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

مما بھی ہنسی خوشی کبھی جیز تو کبھی پری کی شاہنگ کروانے چلی جاتی تھیں۔ چن ان دنوں میرے صحت مند کندھوں پر تھا۔ سو میں جی بھر کر چٹ پٹے کھانوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

ڈیڑی اور پلایا بھی خوب مزے کر رہے تھے۔ ان دنوں دونوں کو پریز بھول چکا تھا۔ میں بھی ٹرامٹی لسٹ کو دیکھتے ہوئے سیمینور تہہ بہ تہہ جاتی تھی۔

بڑی ممتا و عرصہ ہوا چکن کو خیر یاد کہ چکی تھیں۔ پائی بلڈ پریشر کے مرض نے انہیں خاصا عاجز کر دیا تھا۔ اور ماما کو بھی میں اب کم کم ہی چکن کی طرف جانے دیتی تھی مگر جب سے ماما کو میرے پھیلنے وجود کو دیکھ کر شاک لگا تھا اور میرا اب تک رشتہ نہ ہونے کی یہ بہت بڑی "وجہ" معلوم ہوتی تھی تب سے چکن میں میرے واسطے پر پابندی لگا دی گئی تھی مگر خیر اب تو آزادی ہی آزادی تھی اور میں اس آزادی سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔

شادی کے ہنگامے جوں ہی سرویزے ممانے میرا دوبارہ وزن کروایا اور پھر کچھ مدت پوچھنے میں اپنا پندرہ کلو وزن بڑھا چکی تھی۔ ممانے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

میں نے انٹر میں ایڈمیشن کیا لیا مصروف سے مصروف تر ہوتی چلی گئی تھی۔ پڑھائی اور کھانے کے علاوہ مجھے کچھ سوچنا ہی نہیں تھا۔ بڑی ماما کرے میں داخل ہو گئیں۔

"سناؤ! پانوی کی روتی کار شہ بھی طے ہو گیا۔" یہ خبر خاصی روح فرسا تھی۔

"آجھا۔" ماما صدمے کے مارے بول ہی نہ سکیں۔ "اچھی خاصی موٹی اور سالوں سی بھی مگر پوزیشن ہولڈر تھی، مگر کچھ زیادہ ہو گئی تھی، اسی لیے بے چاری پانوی بہت پریشان تھی۔" ممانے میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی آدھری۔

"چلو! پانوی پریشانی تو دور ہوئی۔ اللہ سب کی باتوں کے نصیب اچھے کرے۔" بڑی ممانے صدق دل سے دعا کی۔ نظرس ہنوز مجھ پر تھیں۔ گویا خصوصاً "میرے لیے بھی دعا کی گئی تھی۔"

"روتی پائی کی شادی میں کون جائے گا۔" مجھے اپنے کپڑوں کی فکر ہو گئی تھی۔ سو بے باکی سے پوچھنے لگی۔

"تم تو ہرگز نہیں جاؤ گی۔" ماما کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"کیوں؟ اب تو میں میزنگ بھی کر چکی ہوں۔" میں نے روتی صورت بنا کر کہا۔

"بڑا تیرا ریا ہے تین سال میں میزنگ کر کے۔" ماما تو سالوں کی طرح طنز و تہکہ میں ماہر تھیں۔

"کر تو لیا ہے نا۔ اگر اس دفعہ بھی ٹیل ہو جاتی تو اچھا تھا۔" میں گھس کر بولی۔

"بے وقوف! حق تو ارا عقل نہیں۔ اگلے گھر جا کر نبھانے کون کون سے "گل" کھائے گی۔"

"مجھے گل کو منہ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو اچھی طرح سے خبر ہے میں "گل" سے کس قدر چڑتی ہوں۔" گل ہماری ریڈون تھی، پلایا کے دوست کی بیٹی۔ ان دنوں چٹیاں گزارنے کینڈا لگی ہوئی تھی۔



میں اس وقت میزس پریشادہ کرکینوں کے ساتھ معمولی سا انصاف کر رہی تھی۔ صرف چھ کیلے ہی کھائے تھے۔ جب میری ریڈون کے میزس کی ریٹنگ پر

جنگے ایک ساہ چلتی آنکھوں والے خوب لڑکے نے مجھے سالوں کیا! اٹھاتے دیکھ کر گویا گنتی مکمل کر دی تھی۔

"اب مزید ایک بھی کیا امت کھانا۔ ورنہ تمہارا نہ سہی، میرا اپنا معدہ تمہیں کیلے کھاتے ہوئے دیکھ کر پھٹ جائے گا۔ مائی گا! پیٹ ہے کہ کتنا! ابھی دو سرخ سرخ سیب بھی پلیٹ میں ڈھک کر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کسی اور کے معدے میں ڈالو گی؟" وہ مسلسل بولتا ہوا بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہمارے میزس پر کوہ گیا۔ یہ کیلے سیب تو مجھے ہضم ہو سکتے تھے مگر ان خترم کی بے تکلفی ہر گز نہیں۔

"کون ہو تم؟" میں نے اپنے انڈر پر جلال موڈ میں دباڑنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے میں کافی تکلیف دہ خراشیں پڑ گئیں۔

"میں داؤل کا کیف ہوں۔" ماما نے خاصا جھوم کر بتایا۔

"میں کہہ رہی ہوں! اپنا نام بتاؤ؟" مجھے ایک دفعہ پھر حلاجی بنانا پڑا۔

"بتایا تو ہے۔ کیف ہوں، سرور ہوں، نشہ ہوں، شمار ہوں۔ مستی ہوں۔" وہ پھر سے دلا رہے تھے انداز میں بولا۔

"یہ سارے نام تمہارے ہیں؟ حق! مجھے صرف ایک نام بتاؤ۔" میں نے جھاڑ کر ملامت دراصل میرا ارادہ یہ تھا کہ ریٹنگ پچھانک کر گزارا نہ آئی (گل کی می) سے شکایت لگا کر آتی ہوں کہ گھر میں کس بدتمیز مہمان کو رکھا ہوا ہے۔ جو بغیر اجازت کے دوسروں کے گھروں میں گھس کر بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔" رخسانہ آنٹی تمہاری رشتے میں کیا لگتی ہیں۔"

میں نے آنکھیں دکھا کر پوچھا۔

"ڈیڑی کی بہن۔"

"یعنی تمہاری پھوپھی؟"

"یہی سمجھ لیں۔" اب وہ ریٹنگ کے اوپر جھک کر ہمارے لان کا جائزہ لے رہا تھا۔

"یہ پھول پودے کس نے لگائے؟"

"ساجہ نے۔" میں نے سوچا کیوں نہ تعریف ہی ہو رہی جائے۔

"یہ کون خاتون ہیں؟" وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

"میں اور کون۔"

"اوہ تو آپ کا نام ساجہ ہے۔" اس نے آنکھیں سکڑ کر میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ "آپ کا نام تو کوئی بھاری بھر کم قسم کا ہونا چاہیے تھا۔ دروازہ، سطوت آرایا، ہزیرہ، بیگم۔"

"کیا مطلب؟" میں چیخ اٹھی۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" کوئی میری صحت پر چوٹ کرے تو میں زخمی شیرینی بن جاتی تھی۔ کچھ میں فطرتاً جھگڑا لیتی تھی۔

دراصل اس کے پیچھے بھی بے شمار وجوہات ہیں۔ میرے گھروالوں کی بے شمار زیادتیاں اور ظلم جو عمر کے مختلف ادوار میں مجھ پر نونے رہے تھے۔ شروع سے ہی مجھے ہر بات پر ڈی کرنا۔

میں جو عمار بھائی کے اتنے سالوں بعد اس خالام گھرانے میں پیدا ہوئی تو ان لوگوں کو میری قدر کرنا چاہیے تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ لوگ شکرانے پڑھنے نیازیں مانگتے، مگر وہ کچھ یوں۔ ماما مجھ جیسی جتنائی بچی کو پیدا کر کے بیمار ہو گئی تھیں۔ سارے گھر والے معصوم سی گول کو تھنی بچی کو بھول بھال کر ماما کے غم میں ادھ موے ہونے لگے۔ پلایا نے اس وقت جذبات میں آکر یہ تک کہہ دیا تھا۔ "اس سے بہتر تھا، میں بے اولاد ہی رہتا۔" یہ اس نازک گھڑی کی جذباتی سی کیفیت تھی۔ بعد میں پلایا نے مجھے اپنی آنکھوں کا ستارہ اور ہتھیلی کا چھالا بنانا چاہا تو میری نظر ماما پر میان میں کود پڑی۔

"مرادو! کیا ساقی کو لگاؤ دوس گے۔ ایک ہی ہماری بیٹی ہے۔ اس کی تربیت میں چوک نہیں ہونی چاہیے۔"

ممانے دو سال کی عمر میں تربیت کرنے کے چکر میں مجھے جو خونخوار نظروں سے گھورتا شروع کیا تو اب تک یہی سلسلہ چل رہا ہے۔

میں بچپن سے ہی ماما کے ظلم و جبر کا نشانہ بنتی رہی ہوں۔ ظاہر ہے انکوئی تھی۔ سارے ستم مجھ مسکین

پری ڈھائے گئے۔ عموماً بھائی ایک تو مجھ سے بہت بڑے تھے۔ اوپر سے بلا کے فریال بردار۔ مجھے دیکھ دیکھ کر تو ماما کو ہول پڑتے تھے۔

”ہائے لڑکی ذات اور ایسی بد زبان۔ بولتی ہے تو گویا چھت پھاڑنے کے ارادے سے۔“ بھی عمو کو اپنی آواز میں بات کرتے دیکھا ہے۔

ماما کا خیال تھا قصور میرا بھی نہیں میں اپنی پھوپھی کا مزاج چرا لاتی ہوں۔ سو میری گرم مزاجی سے گھر

والوں نے سمجھو تا کر لیا تھا۔ بس یہی وجہ تھی کہ میں۔ ”محترمہ! آپ کس مراتب میں چلی گئی ہیں؟“ وہ بالکل میرے سامنے اکھڑا ہوا تھا اور میں جو مامی کی بھول بھلیوں میں گم بچپن سے اب تک اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایک دم چونک کر خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو؟“ جوں ہی میری نظر اس کے ہاتھوں تک لگی۔ میرا پارہ چڑھ گیا۔ وہ کہینہ لمبوں کے راس میں کئے ہوئے سیب چٹ کر گیا تھا۔ ”کس کی اجازت سے تم نے میرے سیب کھائے ہیں؟“

”کھانے پینے کے معاملے میں بھلا اجازت کیسی؟“ اس نے میز سے ایک ٹشو بھی اٹھالیا۔ ”جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں چوکیدار کو بلا لاؤں گی۔“ میں نے اسے دھمکا دیا۔ ”چوکیدار نے بھلا یہاں آکر کیا کرتا ہے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔ ”تمہیں اٹھا کر دوسرے ٹیرس پر پھینک دے گا۔“

”اس میں اتنی جان ہے؟“ وہ ہمارے چوکیدار کی صحت پر چوٹ کر رہا تھا۔ ”یہ کلام تو آپ پر سوٹ کرنا ہے اور آپ شاد اللہ سے کر بھی سکتی ہیں۔“

”کون سا کلام؟“

”اب کیا تشریح کروں۔ خیر اللہ آپ کو نظریہ سے بچائے۔“ وہ بیک وقت میرے صحت مند سر اپنے پر بھی چوٹ کر رہا تھا۔ یہاں میرا غصہ کرتا تو بڑا تھا اور غصہ چونکہ میری ناک پر دھرا رہتا تھا، سو میں فوراً ہی پھٹ پڑی۔

”جاتے ہو یہاں سے کہ میں ماما کو بلاؤں؟“ ”اتنا تردد کر کے نیچے جانا ہے تو میرے لیے چائے بھی لٹی آٹا۔ میں یہیں بیٹھ کر کھوں گا۔“ اس نے بڑی دوستانہ مسکراہٹ سجا کر کہا۔

”تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ میں نے چھری اور پلیٹ اٹھا کر کہا۔

”اگر نہ جاؤں تو۔۔۔“ ”تم کس کی اجازت سے ہمارے ٹیرس پر آئے ہو؟“ میں نے خونخوار نظروں سے اسے گھور لیا۔ ”اپنے دل کی اجازت سے۔“ وہ مزے سے بولا اور پیر چھلانا کھڑا ہو گیا۔

”مس ساجیہ مراد! ہم پھر ملیں گے۔ ابھی چلے ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔“ وہ دوسرے ہی پل رینگ سے کود کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ جبکہ میں سمجھتا ہوں نیچے اتر آئی۔

میرا ایف اے میں پاس ہو جانا میرے گھر والوں کے لیے ہفت اقلیم کی دولت مل جانے کے برابر تھا۔ ڈیڈی، بابا اور ماما تو اس خوشی میں کسی بڑی ضیافت کا اہتمام کرنا چاہتے تھے مگر نبیلہ پھوپھو کی بیماری کی خبر نے سارا پروگرام دھم دھم کر دیا تھا۔

میرے اور ڈیڈی کے علاوہ سب ہی اسلام آباد چلے گئے تھے۔ ڈیڈی کو آفس سے چھٹی نہیں ملی تھی اور میں ڈیڈی کی وجہ سے گھر میں رہنے کے لیے تیار تھی۔ ویسے بھی میں پھوپھو کے سوالات کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی۔ انہوں نے تو میرا ناک میں دم کر لیا تھا۔

”سائنس کیوں نہیں پڑھی؟ ایڈمیشن کیوں نہیں لیا؟ کون کون سے بھیکٹ پڑھو گی؟“ اب بھلا پھوپھو کو کون بتائے۔ میں نے مزید نہ پڑھنے کا اعلان کر دیا تھا اور میری بیماری ممانے اس اعلان کو سن کر فی الحال جو اٹھا نے پر بیڑی کیا تھا۔ دراصل میرے انٹرنل پاس ہو جانے کی خوشی میں انہوں نے اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہا تھا۔ اور فی الحال میری بے عرقی کرنے کا ارادہ ترک کر کے اسلام آباد سدھاری تھیں۔

چونکہ پڑھائی کا بوجھ تو ہٹ چکا تھا۔ سو میری آج کل تمام تر توجہ کا مرکز فی وی اور پکن تھا۔

اس دن بھی میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ڈیڈی کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ اس کی ترکیب میں نے ایکس وی چینل کی آئی سے سیکھی تھی۔ میں مختلف ممالوں کے پیسٹ کو چپٹی کی ہوئی چائے کے اوپر لگا لگا کر فرانی کر رہی تھی جب شمو نے مجھے پکن میں آکر اطلاع دی۔

”ساقی بی بی! اممان آئے ہیں۔“ ”کوئی! اس وقت کون ویلا (فارغ) آیا ہے منہ اٹھا کر۔“

میں لال مچھلیاؤں پر گرم مسالا اور زریہ کریم میں مکس کر رہی تھی۔ چائے کو سلاخوں میں لگانا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے ہاتھ دھوئے اور سر پر نکلی شمو کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”کون ہے؟“ ”خود دیکھ لیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے آنکھیں دکھائیں۔ ”دیکھنے کی چیز ہے قسم سے۔“ شمو اپنی اوقات پر اتر آئی۔

”کیوں نہیں۔“ میں نے اسے ڈپٹ کر کہا۔ ”مہمان کو ذرا انگ دہم میں بٹھالیا ہے؟“ ”جی ہاں۔“ اس نے زور سے سر ہلایا۔ ”تو پھر جائے لے آنا۔“ میں لاؤنج میں گے مر

میں اپنا حلیہ دیکھ کر بولی۔

”چائے کے ساتھ کیا لاؤں گی؟“

”نگھٹیں، رول، گلاب اور ہلایک بھی رکھ لینا“ ڈیڈی کے کوئی دوست ہی ہوں گے۔ ”میں نے اندازاً سوچتے ہوئے ذرا انگ روم کا رخ کیا تھا، مگر صوفے پر موجود شخصیت کو دیکھ کر میرے منہ میں گویا کڑوے بادام آ گئے۔

”تم؟“ میں صرف اتنی ہی کہہ پائی۔

”جی، میں۔۔۔ آپ کیوں شاکند رہ گئی ہیں؟ یہاں بیٹھ جائیے، کہیں گرمی جلیے گا صدمے کی شدت سے۔“ وہ اخلاقاً قاتلہ تھے ہوئے بولا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ میں ناراضی سے بولی۔ آج بہت دن بعد میں نے اسے دیکھا تھا۔ شاید سچ کے دنوں میں وہ کہیں چلا گیا تھا۔

”مبارک باد دینے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”ہائے، اسے بھی خبر ہو چکی۔“ میرا دل ڈوب کر ابھرا۔ ”پھر تو تمہاری جان چکا ہو گا۔“

”انتاجیران کیوں ہو رہی ہیں۔ دراصل مجھے رخسانہ آئی نے بتایا تھا۔ سوچا، مبارک دے آؤں۔ ایمان سے بڑی خوشی ہوئی ہے جان کر کے آپ نے انٹرنل پاس کر لیا ہے۔“ وہ سچ بچ بڑی خوشی کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر مجھے صاف طنزی لگا۔

”ٹھیک ہے، خیر مبارک۔“ میں نے اوپری دل سے کہہ ہی دیا۔ ”ویسے تم اتنے دن سے کہاں تھے؟“ نظر نہیں آئے۔ ”میں نے ایسے ہی بات پردھانے کی غرض سے پوچھ لیا تھا۔“

”آپ نے مجھے کس کیا؟“ وہ تو ایسے کھل اٹھا تھا گویا گلاب کا پھول ہو۔

”لو، جی! اگر لوکل۔۔۔ یہاں تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ میں نے منہ بنا کر سوچا، مگر اس کا دل تو بڑا بھی مناسب نہیں تھا، سو انھوں کا ہنر پھیر کر کے بولی۔

”ٹیرس پر نہیں دیکھا سو اس لیے پوچھ لیا۔“ ”دراصل میں کچھ دن تک ”سوگ“ کی کیفیت

میں رہا ہوں۔

”سوگ؟“ میں چونکی۔ ”بھلا کیسا سوگ؟ کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہہ دیا؟“ میری تجسس پسند فطرت انگیزالی نے کرجاگ اٹھی تھی اور فوری طور پر میرے ذہن نے ایک کہانی کا تانا بانا بھی بن لیا تھا۔ گل کے پیار میں پاگل لیکن۔ گل کا ہری جھنڈی دکھانا اور پھر کیف کا سوگ میں اتنے دن غمزدہ رہنا۔ اوھر میرے اندر مارے تجسس کے گدگدی ہونے لگی تھی اور میں بس فحاش ساری کہانی کو جاننے کے لیے بے چین ہو گئی تھی اور اس لمحے مجھے بھول گیا تھا کہ میری پہلی ملاقات کافی ناگوار رہی تھی۔

”بس جی، کچھ نہ پوچھیں۔ لوگوں کے دورے چہرے ہیں۔“ وہ نہجید سے بولا۔

”کس کے؟“ میں حیران ہوئی۔

”ہماری پھوپھو محترمہ۔“ وہ جل بھن کر بولا۔

”مگر ان کے دو چہرے کہاں ہیں؟ مجھے تو صرف ایک چہرہ ہی دکھائی دیتا ہے۔“ میں نے ہونٹ پین کی استہرا کر دی تھی۔

”میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں۔“ وہ جھنجھایا۔

”یہ جو میری پھوپھو ہیں نا۔ ایک نمبر کی بد عمد ہیں۔“ وہ خوب جلا بیٹھا تھا۔

”انہوں نے کیا کیا؟“

”پھوپھو نے کہا تھا ان چھٹیوں میں وہ ضرور ہمارے گھر رہنے کے لیے آئیں گی مگر اب وہ مکرگئی ہیں۔“

کیف نے بسور کر بتایا تھا اور اوھر میرا منہ اتر گیا۔ جو کچھ میں سنا چاہتی تھی اور جس محبت کی کہانی کا مجھے انتظار تھا، سب خواب ہوا، نکھوڑا ہوا اور نکلا کیا؟

”تم گل کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ بھی بس آئے ہی والی ہے۔“ میں نے اس کو تسلی دینے والے انداز میں کہا

تھاکر وہ بول اچھا گویا اسے کرنت لگ گیا ہو۔

”تو بہ کریں جی، پھوپھو کو تو اس لیے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ چند دن کے لیے ہی سہی، میری بچن سے جان چھوٹ جائے گا۔“ میں بھی چار دن سکھ کا سانس

لے سکوں گا۔ مجھے پاگل کہنے نے کانٹا ہے کہ میں گل کو لے جاؤں گا کہ میری مزید سختی آجائے۔ میں دو گھنٹی کے لیے بھی بچن سے باہر نہ نکل سکوں۔ ”کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہا تھا۔ گل کی بدحرامی اور کام چوری مجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا تھا۔ گلابی اور سستی خصوصاً بچن کے کاموں میں محترمہ گل پر ہی ختم ہوتی تھی۔“

”بچن کے کاموں سے تو گل کی جان جاتی ہے۔“ میں نے شو کو نرالی تحیث کر اندر آتے دیکھ کر گھورا۔ اس کے لیے اتنا اہتمام کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ بڑوس سے تو کیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شو کا بھلا کیا قصور ہے۔ آرزو تو میں نے خود ہی دیا تھا اور اوھر کیف نے مجھے ہکا بکا کر دیا۔ وہ کباب کھاتے ہوئے بول رہا تھا۔

”اسی لیے تو میرا اور فیملی پلٹوں کا مشترکہ فیصلہ ہے کہ گل ہماری بھابھی نہیں بن سکتی۔“ میں اس کے لیے چائے بناتے بناتے اچھل کر رہ گئی۔ اس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی۔ میرا چونکا فطری تھا۔

”ہائے گل بھی ٹھکانے لگنے کے قریب قریب پہنچ گئی۔“ حد سے میرا لڑا بھر خون خشک ہو گیا تھا۔

آنکھوں کے سامنے بی آے کی موٹی موٹی کتابیں گھونٹنے لگی تھیں۔ اگر اس سال بھی کوئی امید کی کرن نظر نہ آتی تو مجھے قوی یقین تھا، ماما نے اسلام آباد سے واپس آکر ایڈمیشن فارم میرے منہ پر ضرور دے مارنا تھا اور مجبوراً ”دو تے دھو تے“ مجھے اس فارم کو بھرنا تو ضرور ہی تھا۔ ورنہ ماما سے دھناتی کون کروا تا۔

”پھوپھو کی خواہش ہے۔ میرے بھائی سے گل کی بات نہ جانے مگر میرے اور میری بیٹن جیسے ظالم سماج کے ہوتے ہوئے بھلا یہ بات نہن سکتی ہے۔“

”مگر گل میں بھلا کیا کمی ہے؟“ میں نے مرے

مرے لہجہ میں کہا۔

”نہیں، کمی تو کوئی نہیں۔ ہمارے لیے تو بہت اچھی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ ہمیں گھر سنبھالنے کے لیے عورت کی ضرورت ہے نہ کہ کوئی ایسی آجائے جو

سارے نظام کو ہکا بکا کر رکھ دے۔ اب دیکھیں نا، گل سال کے چھ مہینے بیرون ملک کے دوروں پر رہتی ہے۔ ایسے میں ہمارے گھر کی بھلا کیا حالت ہوگی اور ویسے بھی گل اپنے کینڈا والے چاچو کے بیٹے میں انٹر سٹڈ ہے۔ پھوپھو خواتین کو لہجہ پاتی ہو رہی ہیں۔ خیر یہ ان کا اور گل کا ذاتی معاملہ ہے۔ امید ہے گل پھوپھو کو قائل کر ہی لے گی۔“ کیف نے چوتھا کباب اٹھاتے ہوئے وضاحت کی تھی۔ میں اس کی بات سمجھ کر سر ہلانے لگی۔

”میں پھوپھو کو لینے کے لیے آیا تھا۔ ایک بھائی کے لیے ایک لڑکی دیتی تھی مگر وہاں بات بنتے بنتے رہ گئی۔“ کیف کا منہ اتر گیا تھا۔

”مگر تمہارے؟“ میں نے بے ساختگی سے پوچھ لیا۔

”محترمہ کو کچھ پکنا نہیں آتا۔“

”ہائے“ صرف اتنی سی بات؟

”یہ اتنی سی بات نہیں۔“ کیف نے پچکن رول اٹھایا اور پھر دوبارہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ ”جو خاتون بچن کے نام سے گھبراتی ہوں۔ انہیں شکیس میں سجانے کے لیے تو گھر نہیں لے کر جاتا۔“

”ہاں، یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔“ میں نے فوراً اتفاق کر لیا تھا۔ کیف کو ویسے بھی بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح سے مقلد کو قائل کر لیتا تھا۔

ایکی وجہ تھی کہ صرف چند دنوں میں میری کیف کے ساتھ اچھی دوستی ہو گئی تھی اور اس کا بھی زیادہ ترقوت ہمارے گھر میں گزرنے لگا تھا۔ کیف نے بڑی مہماور میری ماما سے بھی خاصی جان پہچان بنائی تھی۔ ایک تو وہ جلا کا پوتی تھا۔ ایسے ایسے لپیٹے اور چٹپے چھوڑا کہ جس فہم کر اٹھا بندہ بے حال ہو جائے۔ البتہ کیف کی ہمارے گھر میں آمد و رفت رخسانہ آجانی کو پسند نہیں آتی تھی۔ اکثر جب کیف میل ہوتا تو آجانی اسے کسی نہ

کسی ہمارے بلانے آجاتی تھیں۔

کیف چند ہفتوں کے قیام کی غرض سے یہاں آیا تھا۔ اس کے آفس کا کوئی کام تھا۔



اس دن میں مارکیٹ سے کچھ ضروری سامان لینے کے لیے گئی تو کیف سے بھی ملاقات ہو گئی تھی۔ دو دن بعد نظر آیا تھا۔ ان دنوں کام میں بہت مصروف تھا۔ اسی لیے پارک میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ ورنہ تو روزانہ ہی میں اسے قریبی پارک میں میسلے اور موٹا گل فون پر مصروف دیکھتی تھی۔ اس وقت بھی اسے فٹ پاتھ پر چل قدمی کرتے دیکھ کر مجھے بے ساختہ خوشی محسوس ہوئی۔

”کہاں تھے اتنے دن؟“ میں نے بڑے بڑے

تھیلے اس کے ہاتھ میں زبردستی تھماتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ مصروف تھا۔ تم سناتو؟ آج کل کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے بیٹھ کی طرح شانگلے بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”بس، وہی پر حال کا روٹا۔“ میں نے دکھی دل سے بتایا۔

”ماما نے آتے ہی میری ننھی سی جان پر پھر سے کتابوں کا بوجھ لا دیا تھا۔ بقتل ماما کے جب تک شادی نہیں ہوتی، فارغ رہنے سے بہتر ہے، مصروف رہو اور اب تو میں سچے دل سے شادی کے لیے دعا میں

کر رہی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس دفعہ بھی میں ہرگز یاس نہیں ہو سکوں گی اور فیل ہونے سے بہتر تھا“

میں کسی کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھر دوں۔ مگر مسئلہ تو صرف یہ تھا کہ خاندان کا کوئی بھی مرنا بچ نہیں پایا تھا اور خاندان سے باہر نکلنے جھانکنے کی ماما نے مجھے اجازت نہیں دے رکھی تھی اور نہ ہی میرا ایسا کوئی ارادہ بھی تھا۔

”آجی کا ارادہ تم سے جا ب کروانے کا ہے؟“ کیف کا انداز کچھ سوچنا ہوا تھا۔

”نہیں تو۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر کیا ضرورت ہے، خواتین کو ہمیں تکلیف دینے کی۔“ وہ منہ بنا کر بولا۔ ”آجی کو چاہیے تمہاری شادی کر دیں۔“

"لوئی! کر لو گل۔ یہاں کوئی پروڈل آتا تو بات بات بھی تھی۔ بندہ رو دھو کر گھر والوں کو شادی کے لیے منواتی لیتا۔" میں نے کڑھ کر سوچا۔
 "تم بھوک بڑھل کر دو۔" کیف نے اسے نئی راہ دکھانا چاہی تھی۔

"مما ان اوتھے چکنڈوں سے متاثر نہیں ہو سکتیں۔" میں نے مایوسی سے لٹی میں سر ہلایا۔
 "اچھا! ایک اور طریقہ بھی ہے تمہارا بڑا جادو۔" "مگر کیسے؟"

"بھئی! ہر روز جھوٹ موٹ کا دروہنا کرتا۔" "پھر ممالوگ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگیں گی۔" سارا اجماع اچھوٹ جائے گا۔ "میں نے مایوسی سے کہا۔
 "تو ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا۔"

"میں نہیں جاؤں گی مگر ڈاکٹر خود چل کر میرے پاس آجائے گا۔" میں بیزاری سے بولی۔ "کچھ اور سوچو۔" "کہہ دو، میری یادداشت چلی گئی ہے۔ ابھی میں گاڑی نکال کر لاتا ہوں۔ معمولی سی ٹکڑے بعد تم بے ہوش ہو جانا۔" اس نے ایک اور ثور ترین حل پیش کیا جسے سن کر میرا من سن گیا تھا۔

"ناک میرا غائی علاج ہوتا شروع ہو جائے اور پھر ماما اور بابا کو پتا چل جائے کہ میں انہیں پریشان کرنے کے لیے ڈرا رہی ہوں۔"

"ایک اور حل بھی ہے میرے پاس۔" وہ پھر سے سوچ میں گم ہوا۔

"جلدی بتاؤ۔" میں بے صبری سے بولی۔
 "تم خود ہی کرو۔"

"ہائے خود ہی۔" میں گویا بدک کر دوڑ ہوئی۔
 "یعنی مری جاؤں؟ محض بڑھائی سے بچنے کے لیے۔"

میری آنکھوں کے ڈیلے گویا باہر نکلتے گئے۔
 "نہیں تو۔" وہ گویا جھنجھلا کر کہا۔ "مرنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ صرف خود کشی کی کوشش کرنا۔"

میرس سے چھلانگ مار دیتا۔ "وہ اطمینان سے بولا۔
 "ناک میری ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔ میں لتکڑی

ہو کر بستر سے لگ جاؤں۔" ایسے خوفناک مشورے نے مجھے ہیبت ہیبت کر دیا تھا۔
 "بدھو! وحیان سے چھلانگ مارنا ناکہ ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ بس اس کا وحیان رکھنا کہ اس سنٹر کو کوئی دیکھ لے۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" میں نے مشکوک انداز میں اسے گھورا۔ "تم مجھے دنیا سے بھگانے کے طریقے کیوں بتا رہے ہو۔"

"ایک آخری آئیڈیا بھی ہے میرے زر خیر دماغ میں۔" کیف نے چٹکی بجا کر کہا۔
 "مجھے تو معاف کرو۔" میں نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ میں سڑک پار کرنے لگی تھی۔

"ارے سن تو لو۔" وہ میرے پیچھے بھاگا چلا آیا۔
 "کیا ہے؟" میں ناراضی سے بغیر رکے بولی۔
 "تو تم شادی کرو۔" اس نے پھر سے میرا دل جلا یا۔
 "کس سے۔" میں نے بغیر سوچے سمجھے دانت پیس کر بھناتے ہوئے کہا تھا۔

"ایک سے۔" وہ میرے سامنے کھڑا بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ یوں کہ میرا اطمینان پل بھر میں ہوا ہو گیا۔

"نکر۔" میں نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر کیف نے گویا ہاتھ اٹھا کر میری بات قطع کر دی۔

"کوئی اگر مکر نہیں۔ کیا میں اور میری ماما تمہارا ہاتھ مانگتے آجائیں؟" اب وہ بڑے صاف اور دو ٹوک انداز میں بوجھ رہا تھا اور میری حیرت کی گویا انتہا ہو چکی تھی۔
 "مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" میں ہکا بکا رہ گئی۔ "بھلا یوں کھڑے کھڑے رشتے طے پاتے ہیں؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" وہ پھر جوش سا بولنے لگا۔
 "تم ہمارا آئیڈیل ہو ساتی! ہمیں جس لڑکی کی تلاش تھی۔ وہ لڑکی صرف تم ہو سکتی ہو۔ تم میں جو خوبیاں موجود ہیں۔ ہمیں ایسی ہی خوبیوں والی لڑکی کی تلاش تھی۔ میری تلاش یہاں آکر ختم ہو چکی ہے اور میں تمہیں اپنی بھائی بنانا چاہتا ہوں۔"

ہائے! مجھے کھڑے کھڑے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ اپنی اپنی تعریفوں نے تو میرے حواس معطل کر دیے تھے۔ اگر کچھ سنبھل کر کیف کے تاثرات جانچ لیتی تو ضرور ٹھنک جاتی۔ مگر کیا ہے کہ مجھے کسی کو جانچنا پر کھنپا یا سمجھنا تو کبھی نہیں آیا۔ میں بے وقوفی کی حد تک سادہ ہوں۔ ان دنوں مجھے اپنی بے وقوفی کی خبر نہیں ہو سکی تھی، مگر وقت بہت بڑا استو ہے۔ جو باتیں میں باپ اور کتابیں تک سمجھا نہیں سکتیں مگر باتوں کو وقت اچھی طرح سے ذہن نشین کر دیتا ہے۔ اور وقت کی شاکردی میں رہنا کوئی آسان کام نہیں۔



یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب رخسانہ آنٹی نے اچانک کرینڈا شفت ہو جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ شوہر اور بیٹی چونکہ روڈی میں تھے۔ سو وہ تھانویں سے گھبرا کر کرینڈا چلی گئی تھیں۔ ان کی انگیسی میں ابھی تک کیف رہا شہ پڑ رہا تھا۔

آنٹی کے چلے جانے کا بڑی ماما اور میری ممانے خلاصہ صدمہ لیا تھا۔ عرصہ دراز سے وہ ہمارے پڑوس میں رہ رہی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد یوں لگتا تھا گویا برابر والا گھر سناٹوں میں ڈوب گیا ہے۔ آنٹی چلی گئیں تو کیف بھی گدھے کے سر سے سینک کی طرح چند دنوں کے لیے غائب ہو گیا تھا اور میں جو اتنے دنوں سے اس کی علانی ہو چکی تھی، ایک دم بول کھلا کر رہ گئی اور جس دن وہ واپس آیا تھا۔ میں گویا پھٹ پڑی۔
 "بھئی تائے! کہاں! دفع ہو گئے تھے؟"

"سناں تو لینے دو بتاتا ہوں۔" وہ گھاس پر پھسکر مار کے بیٹھ گیا تھا۔

"جلدی سے بکو۔" میں غصے سے بولی۔ اسو بھائی اور غنائی کے بعد کیف ہی تھا، جس سے میں اس قدر بے تکلفی سے پیش آتی تھی اور دوسرے ممالووریا، کیف کی شرافت، نجابت کو دیکھ کر مطمئن تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے کیف سے ملنے اور گپ شپ سے

نہیں روکا تھا اور ویسے بھی، ہم کون سا ہر وقت ملنے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ زیادہ تر پارک میں ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بارک میں بچوں کے ساتھ دالی ہال کھیلتا تھا اور میں ماما کے ہزار مرتبہ مجبور کرنے پر چار پانچ راؤنڈ لینے کے لیے نکل آتی تھی۔ جب تک میں راؤنڈ لیتی تھی۔ اتنی دیر تک وہ والی پل کھیلتا رہتا تھا۔ جوں ہی میں تھک کر کھینچ پڑتا تھا۔ وہ بال پھینک کر بھاگ آتا تھا۔

"یو سا ہے نا میری وہ۔ اس کا برتھ ڈے تھا۔" وہ ہیبت سے صاف گرتا ہوا بولا۔ یو سا اس کی "وہ" تھی یعنی دوست، "مگتیر" یا پھر بیوی۔ اس نے بھی "وہ" کی وضاحت نہیں کی تھی۔ "میں نے بھی کبھی وضاحت طلب نہیں کی تھی۔ دراصل مجھے کریدنے کی کبھی بھی علوت نہیں رہی تھی اور نہ ہی میرا کیف کے ساتھ ایسا کوئی ریلیشن تھا جو میں یو سا کے بارے میں کنکشن رکھتی۔ وہ مجھے خلاصہ ہمدرد، مخلص اور سادہ مزاج لگا تھا اور ان دنوں تو میری ماما کے کہنے پر وہ مجھے آکناٹس اور انگش بڑی دل جمعی کے ساتھ بڑھا رہا تھا اور میں دو تھوک کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی تھی کہ کیف سے اچھا کوئی آج تک مجھے بڑھا یا تھا اور نہ ہی کچھ سمجھایا۔

مما کیف سے بہت خوش تھیں کیونکہ میرے مستہلی ٹیسٹ دیکھ کر ماما کا دل خوش ہو گیا تھا اور وہ اس کامیابی کا سارا کریڈٹ کیف کو دے رہی تھیں۔ میری محنت کو وہ کسی کھاتے میں نہیں سمجھتی تھیں۔
 "تو بتا کر جاتے۔" میں نے ناراضی دہرائی۔

"کیوں بھئی! آپ نے مجھے مس کیا تھا؟" وہ صاف مجھے جڑا رہا تھا۔

"ہو نہ ہوئی نہیں۔"

"تم تو خوش ہو گی، بڑھائی سے جان چھوٹی رہی اتنے دن۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" میں جڑبڑھائی۔
 "تم آوارہ گردی کر آئے؟"

"لڑکی! احترام سے بلایا کرو۔ میں تمہارا استو ہوں۔" وہ خواہ مخواہ استو ہوتا۔

"تمہاری یو سا ٹھیک ہے؟" میں نے جان کر اسے چھیڑا۔

"ایک دم ٹھیک ہے، فرسٹ کلاس۔" وہ دوسرے آکس کریم والے کو آؤ کیجھ کر اٹھ گیا تھا۔

"اور تم؟"

"میں تمہارے سامنے ہوں۔" وہ دو آکس کریم لے آیا تھا۔

"بڑے فریش لگ رہے ہو۔" میں نے اپنا فیورٹ فلیور بنڈ دیکھ کر منہ تالیا۔ "یہ کیسا ہے؟"

"آکس کریم۔"

"مگر مجھے مینگو فلیور پسند نہیں۔" میں نے ناگ چڑھائی۔

"تو نہ کھاؤ۔ مجھے دے دو۔" وہ اطمینان سے بولا تھا۔

"تم سے ایک بات کرنا تھی ساتی۔!" کلنی دیر سوچنے کے بعد وہ بہت شجیدگی سے بولا تھا۔ میں کچھ چونک گئی۔

"کیا؟"

"وہ دراصل میری لما آتا چاہتی ہیں۔" بلا آخر اس نے کہہ دی دیا۔

"تو آجائیں۔ اس میں سوچ بہار کرنے والی کیا بات ہے۔" میں اس کی بات کا مقصود نہیں سمجھی تھی۔ دراصل مجھے بات تو کیا بچے سمجھتا اور چہرے پر دھنا بھی نہیں آتا تھا۔

"میرا مطلب ہے، ایک خاص مقصد کے لیے آئیں گی۔" وہ سر ہٹائے گھاس کے ٹکے نوچ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی خشک گھاس کے ٹکوں کی ایک ڈھیری لگ چکی تھی۔

"کیسا مقصد؟" اب میں کچھ کچھ سمجھ تو چکی تھی۔ تاہم مزید وضاحت بھی ضروری تھی۔

"ایک کے لیے آئیں گی۔ میں نے تمہاری اتنی تعریفیں کی تھیں کہ وہ تم سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی ہیں۔"

اس نے تعریف کا ایک جال میری طرف پھینک دیا۔

تھا اور میں اس جال میں الجھنے کے قریب قریب پہنچ چکی تھی۔ دراصل اپنی تعریف کے ناپسند ہوئی ہے اور میری جن خوبیوں کی میرے گھر والوں کے نزدیک کوئی وقعت یا اہمیت نہیں تھی۔ وہ انہی خوبیوں کو میری نظر میں اور پھر کچھ پیش کرنا تھا۔ دراصل یہ بھی ایک فن ہے۔ شائستگی اور سلیقے کے ساتھ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا فن۔ یہ بہتر بھی کسی کسی کو آتا ہے۔

"تم بہت اچھی کو لگ کرتی ہو۔ تم میں سلیقہ ہے۔ گھر سنبھال سکتی ہو۔" لما کہتی ہیں ایک لڑکی کو بہر فن میں طاق ہونا چاہیے اور وہ عورت ہی کیا جو گھر داری کے قریب سے واقف نہ ہو۔" وہ اپنے مخصوص دیکھے اور پراثر لہجے میں کہہ رہا تھا اور اس کی باتوں سے اس کے عجیب کی تاثیر سے کوئی بھی عقل و فہم والا بندہ قائل ہو سکتا تھا جبکہ میں تو پھر ایک احمق اور بدھوشی لڑکی تھی۔ دراصل میرے لیے بے وقوف اور کم عقل جیسے الفاظ ہی مناسب تھے۔ اس وقت میں سفاکانہ حد تک خود کو احمق ترین مخلوق بھی کہہ سکتی ہوں! ہاں اس وقت مجھے یہ الفاظ بہت زہریلے اور اپنا مذاق اڑانے والے محسوس ہوئے تھے جب مجھے بتایا کہ

"تم احمق اور پاگل ہو ساتی! ہمیں یہ سب تمہارے لیے بہتر نہیں لگ رہا۔"

"آپ تو چاہتی ہی نہیں، میں قدر دان لوگوں میں جاؤں جو میرے سلیقے سے متاثر رہیں۔ جو میری ڈگریوں کی بجائے میرے ہاتھ کے ڈانٹے کی تعریف کریں۔ پلیز ممما! میں ساری زندگی احساس کمتری کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ مجھ سے یہ طعنہ بھی نہیں برداشت ہو سکے گا کہ میں کند ذہن تھی یا پھر میرا اکیڈمک ریکارڈ اچھا نہیں تھا۔" میں احساس کمتری کا شکار تھی اور اسی خوف کے زیر اثر میں نے کیف کے بھائی کے حق میں ووٹ دے کر اپنے لیے ایک بھرے پرے کنبے کا انتخاب کر لیا تھا۔

میرا غم ڈائیر کار زلٹ آیا اور میں خوش قسمتی سے پاس ہو گئی۔ ابھی میری اس خوشی کو سلیپرٹ کر رہے تھے کہ ایک نیا واقعہ رونما ہو گیا۔

پوری زندگی میں شاید پہلی مرتبہ میں نے خوشی کا جھنجھکاؤ کی تیاری کی تھی اور اس سے پہلے کالج کے لیے ضروری چیزوں کی شاپنگ بھی کی تھی۔ ممما اور بڑی ممما اس کلیا پلٹ پر حیران تھیں۔ اور ڈیڈی پلپا بے انتہا خوش۔

مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میرے اندر تبدیلیوں کی اصل وجہ کیف کی ذات تھی۔ وہ میرے لیے ایک مخلص دوست ثابت ہوا تھا اور اس نے مجھے احساس کمتری کے تصور سے نکال دیا تھا۔ اس نے میری ذات کی اہمیت کو اپنے جائیداد لفظوں کا پیرا بن دے کر مجھے پہلے سے بھی زیادہ بااعتماد کر دیا تھا۔ یہ بات بھی مجھے بہت بعد میں پتا چلی تھی کہ دراصل کیف کا مقصد مجھے بااعتماد کرنا نہیں بلکہ میرا اعتماد جیتنے کی کوشش کرنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی اس دن کی جب میں کالج جانے سے پہلے بحث پیٹ ٹائٹ تیار کر رہی تھی۔ ممما اور بڑی ممما اٹل اپنے کمروں میں تھیں۔ ڈیڈی اور پلپا نماز کے بعد سو جاتے تھے۔ جب تک وہ فریش ہو کر میز تک آتے تھے۔ میں ان کی پسند کا ٹائٹ تیار کر چکی ہوتی تھی۔ یہی میری روٹین تھی۔ اس وقت بھی میں نے شمو کے ساتھ مل کر رتن میز پر سجائے تھے جب کیف کی کل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

میں موبائل اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ساتھ ساتھ یونیفارم بھی پریس کر لوں گی کیونکہ میں باقی تھی کیف کی بات کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"استو محترم! خبریت تو ہے۔ صبح فون کھڑا کیا ہے؟" میں نے مباحث کلن سے لگا کر استری کا پلگ لگاتے ہوئے کہا۔

"بس ایسے ہی۔"

"جھوٹ نہ بولو۔" مجھے قطعاً یقین نہیں آیا۔

"سویرے سویرے میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔"

"اتنے بھی تم بچے نہیں ہو، دوست!" میں نے طنز کیا۔

"یہ تو تم نے سچ کہا۔ سو فیصد ٹھیک کہا۔" اس نے فوراً اتفاق کر لیا تھا۔

"ہم ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" میں خواہ مخواہ اترائی۔

نجانے کیوں وہ ہنس دیا۔

"تم بہت سادہ ہو۔"

"شکر ہے، توازش۔" میں اسے چلانے کی غرض سے بولی تھی۔ شاید وہ میری سادگی پر چوٹ کر رہا تھا۔

"بہت تھوڑا ہی ہو۔"

"ٹھیک فرمایا آپ نے۔" میں مزے سے بولی۔

"اور تم بہت چالاک ہو۔"

"ہاں واقعی۔" وہ پھر سے مسکرایا تھا اور اس کی ہنسی کی آواز سن کر میں نے بس ایسے ہی عالم سے بچنے میں کہہ دیا تھا۔

"اور کبھی کبھی یہی چالاک آپ کے منہ پر بھی آپڑتی ہے۔ خود کو عقل کل نہیں سمجھتا چاہیے۔"

"بڑی عقل کی باتیں کرنے لگی ہو۔" دوسری طرف حیران ہونے کی آوازی کی گئی تھی۔

"آخر اس استو کی شاگردی میں ہوں۔" میں نے عاجزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

"فون کیوں کیا تھا؟" میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دوہرایا۔ کپڑے استری ہو چکے تھے۔ اب میں جوتے نکال رہی تھی۔

"آج ملا تمہارے گھر آئیں گی۔" بلا آخر اس نے فون کرنے کی وجہ بتائی دی تھی۔ کچھ بھر کے لیے میں محم سی گئی تھی اور میرے دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہو گئیں۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں کیا تھا اور میری خاموشی سے وہ اپنے مطلب کے معنی افہم کرنے لگا۔

"تمہیں برا لگا؟" حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مجھے ہرگز برا نہیں لگا مگر پھر بھی اس نے پوچھا۔

"مجھے برا کیوں لگے گا۔ آخر کل میرے استو محترم

کی ملا آئیں گی۔ مجھے تو ابھی سے مینو کی فکر ہو گئی ہے۔" کچھ دیر بعد میں نے کافی ہلکے پھلکے پیچھے لہجے میں کہا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ اپنی کونگ کے جوہر دکھا کر ملا کو اس پر بس کر لیتا۔" وہ شاید مسکرایا تھا۔

"مجھے بھلا کیا ضرورت ہے۔" میں نے مصنوعی ناراضی سے کہا اور ہلکے سے کھل منقطع کر دی تھی۔ دراصل میں کچھ گھبراہٹ تھی اور ایسی گھبراہٹ کا شکار بھی میں ہوئی مرتبہ ہوئی تھی اور یہ گھبراہٹ کیف کی ملا کو دکھ کر کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ پہلی نظر میں ہی زندہ کچھ گھبراہٹ اور خوف کا شکار ہو جاتا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی شخصیت کے لیے کون کا سا لفظ مناسب تھا۔ پلوکار، مہذب، پارعب یا براسرار انہوں نے ماتھے تک دوپٹہ لے رکھا تھا۔ ہوں کہ آنکھیں تک دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ جھکا ہوا سر اور جھکی ہوئی آنکھیں۔ خاموش لب سلوہ سا چہرہ آنکھوں میں سلوکی تھی کوئی سوال نہیں تھا۔

صاف بات تو یہ تھی۔ بڑی ممالور میری ماما کو کیف کی ملا پسند نہیں آتی تھیں اور جب گھر والے پسند نہیں آئے تھے تو پھر ایک کو دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈیڈی اور پاپا خاموش تھے۔ فی الحال انہوں نے کوئی رائے نہیں دی تھی اور نہ ہی انہوں نے ایک سے ملنے یا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی جبکہ ممالور بڑی ممانے صاف کہہ دیا تھا۔

"کافی بھری پڑی چلی ہے۔ ایک کے پانچ بھائی، ماں اور خیر سے معذور دادی بھی موجود ہیں۔ مجھے تو ساتھی کے لیے یہ رشتہ پسند نہیں۔ اوپر سے ایک کی ماں نے ہمارے ساتھ کلام تک نہیں کیا۔"

"بڑا خاندان ہونے میں کیا برائی ہے۔" اس وقت تو ڈیڈی اور پاپا کی موجودگی کے باعث میں کچھ نہیں بولی تھی۔ تاہم ان کے اٹھنے کے فوراً بعد مجھ سے رہائیں گیا تھا بول اٹھی۔

"تمہیں کچھ پتا نہیں ساتھی! یہ بیوی کی بات ہے۔

ہمارے درمیان ہی رہنے دو۔ ہم جو مناسب سمجھیں گے۔ وہ ہی فیصلہ کریں گے۔" خلاف معمول ممانے مجھے بغیر ڈپٹے آرام سے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

"ایک ہی تو پوائنٹ مجھے اپنے حق میں مناسب لگا تھا اور آپ اس پر اعتراض کر رہی ہیں۔" میری دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔ کسی بڑے خاندان کا حصہ بننا میرا خواب تھا۔ ایسا گھر جس کے کمین میری تعلیم کی بجائے میرے سلیقے اور سکھانے کے کمن گائیں اور میں اپنے غلوں اور خدمت گزاروں کے جذبے کی بدولت ان کے دلوں کو جیت لوں اور میں جانتی تھی اس وقت ممالور بڑی ممانے مجھ پر فخر کرنا تھا۔ فی الحال تو وہ میرے اکلوتے پتن کی وجہ سے تذبذب کا شکار تھیں۔

"تم شروع سے خمار اور سکون ماحول میں رہنے کی عادی ہو چنا تمہارے لیے ایک پورے غلبے کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہو گا۔" بڑی ممانے مجھے سمجھانا چاہا تھا کہ میں نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

"ماما! یہ پوائنٹ تو بہت دیک ہے۔ میں ہر طرح کے ماحول میں ایڈجسٹ کر لوں گی۔" بات تو کافی بے شری والی تھی۔ اپنے پڑپوئل پر یوں کھلی ڈٹی گفتگو کرنا مگر میں مشرقی لڑکی بننے کی اداکاری کر کے خاموش رہنے کے چکر میں اتنا اچھا پروپوزل ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اب تو کوئی ڈھنگ کا پروپوزل آیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے جو خواتین ہمارے گھر آچکی تھیں۔ وہ سب سے پہلے میرے میٹرک میں گریڈ اور نمبر پوچھنے لگتی تھیں اور جنہیں خبر ہو جاتی تھی کہ میں نے میٹرک تین سال میں کسٹری کیا ہے۔ تو وہ مڑک دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھیں۔

"پلیز ماما! محض اس وجہ سے آپ کیف کے گھر والوں کو انکار مت دیجیے گا۔" میں نے التجا کیا تھا اور اب تو مجھے پورا یقین تھا کہ ماما جو اتنا ہی یس می مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، بلکہ اس کے برعکس ممانے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بھرائی توازن میں بولیں۔

"بنا! ہم تمہارے لیے ہر چیز پر فکرت کرنا چاہتے ہیں۔ تم ہماری اکلوتی بیٹی ہو۔ ہر ماں باپ اپنی اولاد کے لیے حساس ہوتے ہیں۔" ماما بہت دیر تک مجھے سمجھاتی، بھجھاتی رہی تھیں۔ زمانے کی اونچ نیچ۔ اتار چڑھاؤ زندگی کے نشیب و فراز۔ اور میں خاموشی سے سر جھکا کر سنتی رہی تھی۔ مگر میرا دل پھر بھی ایک کے حق میں دوڑنے رہا تھا۔

"ایک دفعہ دیکھ لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔" بہت دیر سوچنے کے بعد بڑی ممانے دھیمی توازن میں کہا تھا۔

"مجھے سفینہ (کیف کی ملا) کا رویہ بہت عجیب لگا تھا بھابھی! ممالور بڑی ممانا بہت دیر گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں سو میں چپکے سے اٹھ گئی۔



آنے والے بہت سارے دن اسی سوچ بچار میں گزر گئے تھے۔ ممالوگ ایک دفعہ جملہ جا کر ایک کو بھی دیکھ آئی تھیں۔ ڈیڈی اور پاپا کے علاوہ اسو بھائی اور عملا بھائی بھی ایک سے مل کر آئے تھے اور وہ انہیں ہر لحاظ سے اچھا لگا تھا۔

"اپنی ماں کی طرح ہے۔ مہذب، خاموش۔ پلوکار اور۔" یہ ماما کا ایک کے لیے بھروسہ تھا۔ ماما کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں اور میں ان کی خاموشی سے بے چین ہو گئی۔

"اور کیا بھلا؟ براسرار۔" میری زبان بھلا رک سکتی تھی۔ ممانے مجھے بیٹھ کی طرح گھورتی سے نوازا تھا۔

"نہیں۔ بہت سنجیدہ مزاج۔" ممانے مجھے نہیں بلکہ خانی کوتا رہی تھیں جو خرابی طبیعت کی وجہ سے جملہ نہیں جاسکتی تھی اور اب شیکے لینے کے لیے صبح صبح اسو بھائی کے ساتھ نازل ہو گئی تھی۔ اسو بھائی اسے ڈراپ کر کے اسے آفس چلے گئے تھے۔

"ایک کا برٹس اچھا چل رہا ہے ماشاء اللہ سے" اس نے چند سال میں ہی بہت ترقی کی ہے۔" بڑی ماما

ایک سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی تھیں۔ "شکل و صورت کیسی ہے۔ گورا ہے؟ کالا ہے؟ سائلا ہے؟ کیسا ہے؟" خانی نے چل کر پوچھا تھا۔ اب کے ممانے خانی کو گھورا۔

"بہت خوش شکل ہے۔ ساتھی کے ساتھ بیٹے گا۔" جواب بڑی ممانا کی طرف سے آیا تھا اور اس جواب نے مجھے بھی مطمئن کر دیا تھا۔

ایک سے چھوٹے چار اور بھائی تھے۔ سب سے بڑا ایک تھا اور اس کے بعد کیف، عون، قاز اور اشعر تھے۔ اور یہ بات سن کر مگر حیران رہ گئے تھے کہ عون اور قاز دونوں شادی شدہ تھے۔ ممانے اس بات پر بھی خاصا اعتراض کیا تھا کہ بیوی کو چھوڑ کر چھوٹے دونوں کی شادی کیوں کی ہے۔ ویسے میری ماما کو اعتراضات تو اور بھی بے شمار تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ ماما کو اپنی قدرے قریبی مائل، بلا لکھی سی بیٹی کے لیے ایک جیسا سہارت، خیر و اور لائق فائق لڑکا پسند آیا تھا۔ سو بھرا پر اکتیہ بھی ممانے نظر انداز کر دیا تھا اور سفینہ آئی کا رویہ بھی۔

بیویوں کے درمیان تمام معلومات طے پا گئے تھے۔ اب مجھے بی اے کی بجائے بی اے ہی کرنا تھا مگر نچانے کیوں سب کچھ حسب فضا ہونے کے باوجود اندر نہیں عجیب سی بے قراری چنگیاں بھرنے لگی تھی اور میں کافی دن تک تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ شاید ممالور پاپا سے دوری کا احساس دل میں چھپن دے رہا ہے۔ دل کو اسی کی دہیز چادر میں لپیٹ رہا ہے مگر یہ احساس پاپا کے گھر سے لے کر ایک کے گھر تک میرے ساتھ رہا تھا مگر اس سے بھی پہلے کچھ اضطراب تو میرے اندر خود بخود بھرنے لگا تھا۔

ایک دن کیف چلا آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ جا کر اپنی شادی کی شاپنگ کر لوں۔ اس میں کوئی اعتراض والی بات بھی نہیں تھی۔ سو ممانے مجھے اجازت دے دی تھی۔

تقریباً تین دن تک شاپنگ کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ اگرچہ شاپنگ بھی میں نے نہ ہونے کے برابر کی تھی۔

ایک تو موت میں کافی جگہ چھلکے اور کم قیمت کے کپڑے لگے تھے۔ دوسرے چھلکے دیے بھی بھاری لباس سے الجھن ہوتی تھی اور جب لپٹنے کی باری آتی تو کیف نے مجھ سے پوچھا۔
”کنگ کیا ہونا چاہیے؟“
”کنگ نہیں۔“
”تو پھر؟“

”میں کچھ اور لوں گی۔“ میں نے بھاری بھر کم لپٹنے دیکھ کر ایک ہانکاسٹیس کلم والا شلوار قمیض پسند کر لیا تھا۔

”شانگ پنگ لے لو، ایک کو یہ کھرہ بند ہے۔“
کیف نے مجھے سرخ رنگ کا انتخاب کرتے دیکھ کر فوراً کہا تھا۔ حالانکہ سرخ رنگ کو میں اپنا کئی کھرہ سمجھتی تھی۔ یہ رنگ میرا پسندیدہ تھا مگر اس کے بلوہود میں نے ایک کی پسند کو اولیت دی تھی۔

شانگ کے دوران ہوسا ہمارے ساتھ رہی تھی۔ ہوسا کیف کی گزن اور منجھیر تھی اور جس طرح کیف اس پر دل کھول کر خرچ کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کیف ہوسا سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ کیف کی ہوسا کے لیے محبت اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی اور میں وہ وقت سے کہہ سکتی تھی کہ اتنی خریداری میں نے نہیں کی تھی جس قدر ہوسا نے کی تھی۔ منگے ترین کپڑے اور سونے کے زیورات، اس کے علاوہ بھی نجانے کیا کچھ۔

میرا سلمان کیف نے میرے حوالے کر دیا تھا اور یو سا پوری گاڑی اپنی چیزوں سے بھر کر چلم چلی گئی۔ حالانکہ جب میں برائیل ڈسٹریس خرید رہی تھی تب کیف برابر مجھے تیار کرتا تھا۔

”ہاتھ ہولا رکھنا فریڈ! تمہارے انہوں نے میری جیب میں کچھ خاص رقم بھر کر نہیں بھیجا۔“

”اپنے بھائی سے کہنا وہ شادی کر رہا ہے یا پھر برتھ ڈے سیلیبوسٹ کر رہا ہے۔“ میں نے بھنا کر کہا تھا۔

اگرچہ مجھے خود ان باتوں کا خاصا خیال تھا مگر کیف کا بار بار جانتا تھا مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔
پھر ایک دن کیف نے اچانک فون کر کے مجھے حیران کر دیا۔ ”ایک سے بات کرو گی؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”میں۔۔۔ مگر کیوں؟“ میں گھبرا اٹھی۔ شادی میں چند دن تو رہ گئے تھے اور آج سے پہلے اور حسرت کوئی ایسا معاملہ سامنے نہیں آیا تھا اور پھر ماما سے پوچھنے بغیر میں بھلا کیسے بات کر سکتی تھی۔

”بس ایسے ہی تم میں کرنا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔“ کیف نے مزید کچھ سننے سے پہلے فون رکھ بھی دیا تھا۔ آج تو تھا کہ کیف کو بھی میں سمجھ نہیں پاتی تھی۔ عجیب سا بندہ تھا۔ گھڑی میں تو لگے گھڑی میں ماش۔

ان ہی الجھی سلجھی سوچوں سمیت شادی کا دن بھی آگیا تھا۔ اس دن عالم لڑکیوں کی طرح مجھ پر بھی گھبراہٹ سوار تھی اور آنسو بھی وقتاً فوقتاً بغیر کسی وجہ کے گرتے جا رہے تھے۔ ماما اور بڑی ماما میرے سامنے خود کو بتاؤں رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر یہ کوشش کبھی کبھی باکلام ہو جاتی تھی۔ پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ گھر کے لان میں شامیانے لگے تھے۔ رات کو مندی کی تقریب کا انتظام ہوٹل میں تھا۔ البتہ بڑی ماما کی خواہش تھی کہ رخصتی کسی ہوٹل سے نہیں بلکہ گھر سے ہونا چاہیے۔

نکاح سے کچھ دیر پہلے میں نے عجیب سی دہلی دہلی سرگوشیاں سنی تھیں اور کچھ دیر بعد کھل کر بات سامنے آگئی۔ کیف نے ماما سے بڑے واضح لفظوں میں کہا تھا۔

”آئی جی! آپ نکاح نامے میں حق ممر کے طور پر ایک سے کچھ بھی لکھوائیں۔ ساتھی کے تحفظ کے طور پر۔“

”پرینٹ! اس کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ شرعی طور پر ہو گا۔ نہیں منکھور ہے۔“ ماما نے سلیتے سے کہا تھا۔

اگرچہ بات تو درست تھی مگر میرے والدین اس چیز کو کافی غیر مناسب سمجھتے تھے۔

”نہیں آئی! ضرورت ہے۔ یہ ساتھی کا حق ہے۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا تھا۔ ”میں ایک سے بات کرنا ہوں۔“ وہ اپنا گھر چار فرنیچرز میں سے دو فرنیچرز اور کارخانہ ساتھی کے نام لکھ دے۔ یہ ساتھی کا حق ممر ہو گا۔“

”مگر یہ تو بہت زیادہ ہے۔“ ماما گھبرا کر بولیں۔
”اتنا بھی زیادہ نہیں۔ میں نے کہا تھا یہ ساجیہ کا حق ہے۔“

اس کا اندازہ دو ٹوک قسم کا تھا۔ ماما جی ہو گئی تھیں۔ اگرچہ مجھے بھی یہ حق ممر بہت زیادہ لگ رہا تھا مگر میں بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھی ورنہ ضرور بول اٹھتی۔

”ایک کیا سمجھے گا۔ ہم کس قدر لالچی ہیں۔“ مجھے یہی سوچ تارے ڈال رہی تھی۔ میں ماما کو منع کرنا چاہتی تھی مگر لالچ اور ڈنڈی کے ساتھ مولوی صاحب کو دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ اگرچہ سننے میں آیا تھا کہ ایک نے کیف کے اس مطالبے پر کافی ناگواریت کا اظہار کیا تھا۔ وہ مان نہیں رہا تھا مگر نجانے کیسے کیف نے اسے متاثر ہی دم لیا۔ کیف کے خلوص اور ہر روزانہ فطرت کی میں کچھ اور قائل ہو گئی تھی۔

سفید پیگم یعنی کیف کی ماما اس وقت بھی کچھ نہیں بولی تھیں۔ جب حق ممر کے متعلق دہلی دہلی سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ تب بھی وہ خاموش اور سر جھکائے بیٹھی رہی تھیں۔ نہ ان سے کسی نے پوچھا تھا، نہ مشورہ لیا اور نہ ہی بیوہ چڑھ کر انہوں نے بولنے کی کوشش کی تھی۔ ایک چپ تھی ان کی، جو گھر آنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

بس انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر خاموش لیوں سے ایک دعا دی تھی اور میرے لیے ان کی یہ دعا پوری زندگی کا حاصل تھی۔

”سدا سسکی اور آباور ہو۔“



ایک کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات نے میرے سارے خدشات دور کر دیے تھے۔ مجھے خوف تھا کہ وہ ضرور حق ممر میں لکھوائی جائے والی لمبی چوڑی جائیداد کے طعنے دے گا جسے گایا کبھی بکھار فطری مار مارے گا۔ تاہم ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے لیے ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر ثابت ہوا تھا اور اس کی محبت پر پہلے روز ہی میرا دل ایمان لے آیا تھا۔ سب سے بڑی عزت بات یہ تھی کہ اس نے میرے تعلیمی ریکارڈز کا ریکارڈ ہرگز نہیں لگایا تھا بلکہ اس معاملے میں بھی اس نے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔ عموماً وہ زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی اس کی گپ شپ نہ ہونے کے برابر تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنی ماں اور بھائیوں سے بے حد محبت کرتا تھا اور مجھ سے بھی اس نے صرف اتنی ہی کہا تھا۔

”ساجیہ! مجھے امید ہے تم میرے گھر میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہو گی۔ پلیز! میری ماں اور بھائیوں کی عزت کرنا۔ ان کا خیال رکھنا۔ اس گھر میں سب سے مظلوم ہستی میری والدی ہیں۔ میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈال رہا، بس دن میں کبھی کبھار ان کی خبر گیری کر لیا کرتا اور دوسرے نمبر پر میری ماں ہیں۔ ان کی ذات بھی قابل توجہ ہے۔ تھوڑا سا وقت انہیں بھی دے دیا کرتا اور بس، میرا تم سے کوئی مطالبہ نہیں۔ میں ہمیشہ تم سے قلمس رہوں گا اور تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ بس ایک وعدہ کرو، کبھی بھی اپنے دل کو کسی اور کے خیال سے آلودہ نہیں کرو گی۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں مگر بے وفائی ہرگز نہیں۔ جس کیف نے میرے لیے پسند کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم ہم سب کے حق میں بہتر ثابت ہو گی۔ ہم بھائیوں میں بہت پیار ہے۔ ہمارے اس پیار کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرنا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اسے سرشار کر دیا تھا۔

میرے لیے ایک کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ جس طرح ایک نے مجھے اپنے دل میں جگہ دی تھی اسی طرح وہ بھی میرے دل کے ہر گوشے میں سا گیا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ بیش چاہے جانے کے لائق بہت اچھا بہت نیک بہرہ ویز۔ ایسے ہی لوگ بیش دلوں پر حکومت کرنے کا فن رکھتے ہیں۔ یہ رشتہ آئی اسی لیے تو ایک کو اپنا دلانا بنا چاہتی تھیں۔ جب اوپر سے دل برداشتہ ہو گئیں تو پھر پڑی اور شوہر کے پاس چلی گئیں۔ ایک اور کیف کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کسی اور نے حاصل نہیں کی تھی۔ عون اور فائز دونوں نے انٹر کے بعد بشادی کر لی تھی اور دونوں ہی ایک کے کاروبار سے منسلک ہو گئے تھے۔ دونوں کو مناسب جاب ایک نے ہی مل سکی تھی۔ مگر وہ اپنی فیملی کا بوجھ خود اٹھا گئیں۔ اشعر ہاشم میں مقیم تھا۔ مگر کسی گھر آتا تھا۔ البتہ عون اور فائز کی بیویاں بنا اور بھی گھر میں ہی ہوتی تھیں اور گل سے بھی پیڑھے کرسٹ اور ٹائل تھیں۔ پورا گھر نجمہ بی کے کندھوں پر تھا۔ وہ سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ جو مرضی پکارتی تھیں اور جیسا مرضی پکارتی تھیں سب صبر اور شکر کر کے کھا لیتے تھے کہ گھر کی خواتین نے بھی ضرورت کے وقت جی جگن میں نہیں جھانکا تھا۔

کیف ٹھیک ہی کہتا تھا۔ ان کے گھر میں سلتے، قرینے کی بہت سی تھیں۔ تاہم یہ بات سراسر غلط تھی کہ جگن کیف سنبھالتا ہے۔ شاید اس وقت مذاقا "اس نے کہہ دیا ہو گا تاہم میں تو صرف مجھے ہی کوئی ہر ایک پر رعب جلتے اور کاموں کا رونا روتے دیکھ رہی تھی۔ ایک بہت مصروف رہتا تھا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا کہ وہ رات سے پہلے گھر نہیں آتا تھا۔ مجھے ہی بتایا کہ ایک کھانا ہر سے کھا لیتا ہے اور مجھے سالن کے ٹائم پر ملو بے دیکھ کر ان کی بات پر یقین آیا تھا۔ ایسے ملو بے سے باہر کا کھانا ہی بہتر تھا۔ مگر گھر کے مو

بے چارے بھلا کیا کرتے۔

لما کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ وہ پورا دن عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔ گویا انہوں نے

دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ ایک عرصے سے ان کی بیوی زمین تھی۔ تینوں وقت کا کھانا انہیں کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ سی، آٹا قندہ جیسی داوی بھی پتنگ پر چرت لیٹے بس پھٹ کو گھورتی رہتی تھیں اور جب اس کام سے تھک جاتیں تو پھر گہری نیند میں کم ہو جاتیں۔ مجھے ہی جیسے تیسے بد مزہ سی خنی انہیں پڑ جاتی تھیں۔ نیا اور بھی نے بھی ساس اور داوی ساس کے کمرے میں جھانکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن اسے لگے اپنے اپنے کمروں میں بندنی وی دیکھنے میں مصروف رہتی تھیں۔ دونوں کے پاس ایک ایک بچہ تھا اور ان کی اپنی بے شمار مصروفیات تھیں۔ سو وہ گھر پر بھلا کیوں توجہ دیتیں۔ سونے، کھانے اور آرام کرنے کے علاوہ ان کا تیسرا محبوب ترین مشغلہ پارلر کے چکر لگانا تھا۔ صحت اور حسن کو نکھارنے کے علاوہ کوئی اور کام ان کے پاس نہیں تھا۔ اس گھر کی خواتین کی روئین دیکھ کر تو مجھے فحش آنے لگے تھے۔ "نیا اور بھی گھر کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتیں۔" میں پورا ہفتہ ماما کے کمرے پر جگن کے بعد واپس آئی تھی۔ یہاں آتے ہی اسی گند کی غلاظت نے استقبال کیا تھا۔ رانی اگرچہ صفائی کر کے تھی مگر پھر بھی جگہ جگہ فوٹ کے چھلکے اور ٹائفل کے ریمز پڑے تھے۔ حتیٰ کہ صوفوں کے اوپر ہسٹکس کا چور بھی شکن سے بکھرا ہوا تھا۔ اگر لڑائی میں بیٹہ کرپٹ ہو جائے گی تو پھر جھوٹے برتن اور چھلکے سینے میں کتنا ناگم لگ جاتا تھا۔ رات کو ایک اپنے مخصوص ٹائم یعنی ساڑھے گیارہ بجے گھر آیا تو میں نے کافی ناگواری سے اپنے بھرے دل کو خالی کرنا چاہا تھا۔ "وہ اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتی سواس لیے۔" وہ فریض ہو کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ ایک کواور مجھے بھی لی وی سے دیکھی نہیں تھی۔ سو ہمارے کمرے کا لی وی خاموش رہتا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" میں بر لمان گئی۔ "جس گھر میں قیام ہو چاہے وہ کرائے کا ہی کیوں نہ ہو اسے اپنا سمجھ کر اس کی حفاظت اور درجہ بھل کرنا چاہیے۔" اس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔ "مگر انہیں بھی ایسا سوچنا چاہیے۔ رانی ایک دفعہ صفائی کر جاتی ہے۔ پورا دن ہمیں خود ہی گھر کو صاف رکھنا ہوتا ہے۔ اگر گندگی یا پھسلاوا انہیں سمیٹیں گے تو اگلے دن تک بھلا کیا حالت ہوتی ہوگی۔ بچے اس گندگی میں کھیلنے لگتے ہیں۔ فرش سے گندی چیزیں اٹھا کر کھاتے ہیں۔ اسی لیے آئے دن ڈاکٹروں کے پاس بھانک رہتی ہیں۔" میں نے کلس کر کہا تھا۔ اپنا سچا سچا سیکے والا گھر دیکھ کر آئی تھی سوا سی لیے طبیعت خاصی اوب رہی تھی کیونکہ میرے پیچھے اس کمرے کی صفائی تک نہیں کروائی گئی تھی۔ فرنیچر پر گرد کی ایک تہہ چمک رہی تھی۔

"اب بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ عون اور فائز کو چاہیے ان چیزوں کی طرف دھیان دیں۔ بیویوں سے کہیں کچھ اور نہ سہی کم از کم جگن کی طرف توجہ خود دے لیا کریں۔" میں نے پھر کاراشن دس دن میں اڑ جانا ہے۔ ظاہر ہے جب گھر کی خواتین توجہ نہیں دیں گی تو ہر چیز کو ضائع کر دیا جائے گا مگر میں شروع سے ہی ایسے حالات ہیں۔ داوی اور ملا سیدھی ساڑی خواتین تھیں۔ پکانا، کھانا آتا نہیں تھا۔ شروع سے ہی مجھے ہی سنبھالنا تھا۔ نیا اور بھی نے یہی کچھ دیکھا ہے۔ سو انہیں جان مارنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ خیر پھوٹو، ان باتوں کو یہ بتاؤ گھر والے کیسے ہیں؟ سفر میں پر اہم تو نہیں ہوئی؟

ایک نے بات بدل دی تھی۔ جس بات کا کوئی نتیجہ نہیں لگتا تھا۔ اس پر بھلا جگن میں وقت کیوں ضائع کیا جاتا۔ اب وہ میرا حال احوال پوچھ رہا تھا۔ وہ میرے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بہت دھیان سے سنتا تھا۔ اگرچہ چھوڑ کر تو مجھے ایک ہی آیا تھا تاہم واپس میں ڈرامیور کے ساتھ آئی تھی۔ ایک ہفتہ تک

رہتا تو نہیں تھا مگر چونکہ ملاو بھائی فیملی سمیت کراچی سے آگئے تھے سوالن کے بچوں کے لیے میں وہاں رک گئی تھی۔ حالانکہ میرا ابھی مزید رہنے کا ارادہ تھا مگر ایک نے مجھے ایک دن بھی اوپر نہیں رہنے دیا تھا۔ "مسئلہ تو کوئی نہیں تھا مگر میں نے آپ کو بہت مس کیا۔" میں ہونٹوں میں مسکن دباؤے مزے سے بولی۔ اگرچہ میں نے سچائی کو ظاہر کیا تھا مگر ایک میرے اس کچ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ "سراسر جھوٹ۔ اگر مس کرنا ہی تھا تو میرے ساتھ ہی واپس آ جاتیں۔"

"پورے دو ماہ بعد گئی ہوں جناب۔ صرف ایک ہفتے کے لیے۔" اور میرے لیے یہ ہفتہ پورے دو ماہ کے برابر تھا۔ دن گزرتا تھا نہ رات۔ "وہ میری طرف دیکھ کر دلکشی سے مسکرا دیا۔ "سراسر جھوٹ، اگر ایسی بات تھی تو آ جاتے۔"

میں لالٹ سے بولی۔ "بس جی گیا کریں۔ مجبوری تھی۔" ایک نے ٹھنڈی تو بھری۔

"کیسی مجبوری؟" میں نے آنکھیں دکھائیں۔ "میری جان! کاروبار سلطنت کی مجبوریاں کیا کم ہیں۔ ذرا ادھر ادھر ہو جاؤں تو لاکھوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے بولا تھا۔

"دیکھو بھلا فائز اور عون وغیرہ ہوتے تو ہیں۔" "مگر وہ اتنی توجہ نہیں دیتے۔ لاکھوں کا نقصان ان کی نظر میں کچھ نہیں ہوتا۔ اگر میری غیر موجودگی میں کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو وہ لوگ سنبھال نہیں سکتے۔ ابھی نا سمجھ ہیں۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ جائیں گے۔"

وہ حد درجہ سنجیدہ تھا اور خاموش ہی رہتا تھا۔ کم بولتا تھا مگر بہت اچھا بولتا۔ زیادہ تر میں ہی اسے بولنے پر اکساتی تھی۔ خود سے کبھی بھی گفتگو کا آغاز نہیں کرتا تھا۔ ہاں محبت لٹانے کے معاملے میں وہ کنجوس ہرگز نہیں تھا اور اظہار کے معاملے میں تو پاگل نہیں۔ اپنے مخصوص لمبے میں دھیما دھیما بولتا وہ سیدھا حال

میں اتر جاتا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ میرے بازو پر ہاتھ رکھے بڑی نرم گرم جذبے لٹانی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کے علاوہ کچھ اور سوچ سکتی ہوں۔“ میں اس کی محبت لٹانی نظریں سے نظر اٹائی تھی۔

”ہیش ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ اس کا گلیمر لہجہ یوں ہی دل دھڑکا رہا تھا۔

”بھلا کیسے؟“ میں نے بوجھل پلکوں کو بشکل افشا کر پوچھا۔

”تسماری سوچوں میں، خیالوں میں، باتوں میں صرف میں ہوں، میرے علاوہ کوئی اور نہیں۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔

”میرا دل پکا ایمان دار ہے۔ بے ایمانی نہیں کرتا۔“

”اور میں اسے بے ایمانی کرنے بھی نہیں دوں گا۔“ وہ میرے کان کے قریب گنگنا رہا تھا۔ ایک کی قربت کا شمار اس کی آنکھوں سے ہوتا ہوا میرے دل میں اتر آیا تھا اور میں اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کی آواز اپنے کانوں سے سن رہی تھی۔

دن کچھ اور آگے سر کے ٹوکر کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے کچن ہی میں جگہ پورے گھر کا انتظام سنبھال لیا تھا اور میرے اس عمل سے کسی اور کو تو نہیں البتہ نجمہ بی کو خلاصا دھکا پہنچا تھا۔ انہوں نے دے دیے لفظوں میں مجھے سمجھانا بھی چاہا تھا۔ ان کی ہر ممکن کوشش تھی کہ میں امرو خانہ داری سے دور رہی رہوں مگر میں نے ان کی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔

میرے کچن سنبھالنے ہی ہر چیز میں ترتیب اور نفاست نظر آنے لگی تھی اور خوش رنگ کھانے دیکھ کر تو کیف کے علاوہ عون اور فائز بھی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکتے تھے۔

اس گھر کے افراد کا ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ سب لوگ

ایک جگہ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ رات کو مرد حضرات گھر میں ہوتے تھے مگر پھر بھی کھانا اپنے اپنے کمروں میں ہی کھایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود تقریباً سب ہی ہر روز نئی دشن کو دیکھ کر نہ صرف چونکے تھے بلکہ فرقا، فرقا، سب ہی نے میرے ہاتھ کے زائے کو سراہا بھی تھا۔ ان میں نیا اور کسی بھی شمل تھیں۔

”ساتی بھائی! آپ تو بڑا اچھا کھانا بنا رہی ہیں۔ کیا باقاعدہ کورس کیا ہے۔“ کسی تو کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آ رہی تھی۔

”نہیں، میں نے اپنی بڑی ماما سے سیکھا ہے۔“ میں بھلا جھوٹ کیوں بولتی۔

”آپ میں بہت سلیقہ ہے بھائی!“ اب کے نیا نے کہا۔ ایک بات تو اچھی تھی کہ یہ دونوں میری تعریف سے نہ جلتی تھیں اور نہ ہی سر اٹھنے میں مجھ سے کام لیتی تھیں۔ اور پھر میں کون سا کسی سے تعریفی سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے کام کرتی تھی۔ یہ میرا گھر تھا اور ایک کے حوالے سے اس گھر کا ہر کام میرے لیے اہم تھا اور ہر فرد اہم ترین۔

کچن کی حالت بہتر کرنے کے بعد میں نے داوی کا کمر دیکھا تھا۔ وہ اس گھر کی بزرگ، ہستی تھیں، مگر ان کی اہمیت اور حالت کسی نوٹے پھوٹے ناکارہ مسلمان سے بڑھ کر نہیں تھی۔

سب سے پہلے میں نے ان کے لیے آئرن راز کا سٹیکل بیڈ منگوایا جس کا گدا انتہائی نرم اور آرام دہ تھا۔ اس پر انے قدیم پنگ کو اٹھا کر اسٹور روم میں رکھوا دیا تھا۔ داوی کے کمرے کے صدفوں پر انے پردے میل کچیل اور دھول مٹی کے باعث اپنی اصل رنگت کھو چکے تھے۔ انہیں اتروا کر کوڑے دان میں پھینکوا دیا اور نئے پردے دیے تھے۔ چھتیں دو دروازے اور کھڑکیاں جھاڑیں۔ فرش کو سرف ڈال کر گرڈز کے رالی سے دھلوا دیا۔ کمرے میں اسٹنہ سالوں سے رہتی ہو کر دھیرے دھیرے ہی سخی خاتمہ ضرور ہو گیا تھا۔

داوی کے سارے کپڑے استری کروا کر الماری میں ترتیب سے رکھے تھے۔ ایک سفید رنگ کا سوٹ انہیں نسا، دھلا کر پہنا دیا۔

اور جب دوبارہ انہیں کمرے میں لایا گیا تو ان کی بوڑھی آنکھیں روشن روشن منظر دیکھ کر نمی کے باعث چمکنے لگیں۔ وہ بول نہیں سکتی تھیں مگر اشاروں سے انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ بہت خوش محسوس کر رہی ہیں۔ انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلوایا اور میرے ہاتھوں اور سر کو چومنا تھا۔ اس محبت کے اظہار پر میری آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ میں نے داوی کے سفید جھاگ جیسے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”داوی! اس میز پر کھلے رکھے ہیں۔ آؤ بھی موجود ہیں۔ یہ پھل نرم ہے۔ آپ آسانی سے کھا لیں گی۔“ بوا مل پانی بھی پیاس ہی رکھا ہے۔ آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہوئی تو یہ کھنی بجائیے گا۔ رانی فوراً آجائے گی۔ میں ابھی آپ کے لیے مزید ارسا سوپ بنا کر لاتی ہوں۔“

”ہاں، ہاں۔“ داوی گویا میری بات سمجھ چکی تھیں، سو اسی لیے اثبات میں سر ہلانے لگیں۔ میں نے ایک سے کہہ کر ایک نرس کا بندوبست بھی کروا لیا تھا۔ یہ نرس بہت اچھی تھی۔ یہ وہ عورت تھی۔ داوی کی جی جان سے دیکھ بھل کرنے لگی۔ انہیں نسا، دھلائی۔ روزانہ نیا سوٹ پہنانی احتیاط سے کھانا کھلاتی تھی۔ وقت پر دوادیتی۔

داوی کو خوش باش اور بہتر حالت میں دیکھ کر مجھے لگتا تھا گویا میرے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔ اسی طرح ملکا کا گھر ابھی ابھی کا شکار تھا مگر پھر میرے ہاتھوں نے اس کمرے کو بھی سنوار کر ہی چھوڑا تھا۔ ملانے بھی مجھے اپنی من مانی کرنے دی تھی۔ داوی کی طرح انہوں نے بھی خاموشی سے مجھے سراہا ضرور تھا اور میرے سر پر پہلے دن کی طرح ہاتھ رکھ کر خاموش سی دعا دی اور پھر صبح کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

گھر کا اندرونی نظام میرے ہاتھ میں کیا آیا، نہ صرف

گھر میں سلیقہ نظر آنے لگا بلکہ کچن کے اخراجات بھی نہ ہونے کے برابر ہو گئے تھے۔ راشن ختم ہونے کا ہام نہیں لیتا تھا۔ اور جو پیسے بھی مختلف بلز اور راشن کے لیے ایکسٹرا تھا۔ ان میں سے بھی کافی بچ جاتے تھے۔ حالانکہ پہلے پہل مہینے میں دو دو دفعہ راشن آتا تھا۔ جوں ہی میں نے یہ بات نجمہ بی سے کی تو وہ ٹھنڈے لہجے میں بولیں۔

”بوا! میں بھلا کیا کروں۔ کیف بوا، راشن اور بل وغیرہ کے پیسے مجھ سے لے جاتے تھے۔ مگر نہ مل ادا ہوتا تھا اور نہ ہی راشن آتا۔ مجبوراً میں پھر ایک سے پیسے مانگنے کھڑی ہو جاتی تھی۔“ نجمہ بی جی تو کہہ رہی تھیں۔ انہیں بھلا اس برہا پے میں نبھوت بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

”اگر کیف کو پیسے چاہیے ہوں تو ایک سے مانگے۔ گھر کے اخراجات میں سے پیسے کیوں لیتا ہے۔“ میں الجھ کر رہ گئی۔

”ان ہی کے پیسے ہیں جی، جہاں سے مرضی لیں۔ ہم تو اس معاملے میں بول نہیں سکتے۔“ وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

”بوا! میں ذرا آرام کروں۔ اللہ تمہیں سکھ دے، جب سے آئی ہو۔ میری بوڑھی بیٹیوں کی بچت ہو گئی ہے۔“ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں تمام زندگی ان کا اسی گھر میں قیام رہا تھا۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں، سو ایک کے اپنا قوم انہیں اپنے گھر لے آئے تھے۔ یہ ان کی خاندانی ملازمہ تھیں۔

میں اٹھ کر کچن میں آئی۔ رات کے کھانے کی تیاری کرنا تھی مگر ماما کی فون کل نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ فون بند کر کے ابھی کچن میں قدم رکھا ہی تھا، جب کیف آمدھی طوفان کی طرح چلا آیا۔

”نجمہ بی کمال ہیں؟“ مجھ کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا تھا۔ ”وہ آرام کر رہی ہیں۔“ میں کچن کا پیکٹ کھول کر گوشت کا حساب لگا رہی تھی کہ ایک پیکٹ سے رات کے لیے ساکن بن سکے گا۔

"اور تم کیا کرنے لگی ہو؟"

"کھانے کی تیاری۔" میں نے ایک اور بیکٹ فریزر میں سے نکالے ہوئے بتایا۔

"یہ کلام مجملی کے سرور ہی رہنے دینا تھا۔"

"کیوں؟ میں نہیں کر سکتی کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"بہت اچھا کرتی ہو۔ مگر خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم نے اور ایک نے ہنی مون کے لیے نہیں جانا۔" وہ کچھ کہتے کہتے بات پلٹ گیا تھا۔

"نہیں بھلا ہنی مون کے لیے جانا ضروری ہے۔"

"بہت ضروری ہے۔ تم لوگوں کو کیسے بھوننے پھرے ضرور جانا چاہیے۔" وہ اسٹول سمجھ کر بیٹھ گیا تھا۔ یعنی اس کا ابھی مزید گفتگو کرنے کا ارادہ تھا۔

"تمہیں ایک سے بات کرنا چاہیے تھی۔" وہ مجھے آکسا رہا تھا۔

"دیکھو گی۔ ایک فارغ ہوں گے تب ہی تو کیسے جاسکے گا۔" میں نے نوکری میں سے پیاز نکال کر چیلنا شروع کر دی تھی۔

"اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرو گی تو پھر یوں ہی بیٹھی رہ جاؤ گی۔ وہ نہیں فارغ ہونے والا ہے۔ کاروبار یہ روپیہ پیسہ اسے جان سے زیادہ پیارا ہے۔ اوھر اوھر ہونے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب یہ تمہاری محبت پر منحصر ہے کہ تم اپنی بات اس سے منوا سکتی ہو یا نہیں۔" وہ بڑے عجیب سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اگر تو تمہاری محبت کا پلڑا بھاری ہوا پھر تو سمجھو تم کامیاب ہو گئیں۔"

"مجھے ایک کی محبت پر شک نہیں ہے۔ اگر وہ فارغ ہوئے تو ضرور میری بات مان لیں گے مگر۔ مجھے ان کی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ سو اس لیے میں اپنی وجہ سے ایک کو پریشان نہیں کر سکتی۔" میرا انداز وہ ٹوک جھم کا خاصا اور روکھا تھا۔ تب ہی تو کیف کالجہ بھی بدل گیا اور گفتگو کا انداز بھی۔

"اتنی مشرقت کا اظہار کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔" ویسے ہی تمہارے دام میں پھنس چکا ہے۔"

"کیف! میں اس کے الفاظ سن کر دنگ رہ گئی تھی۔"

"تم کس قسم کی لہجہ کو بوجھ کر رہے ہو؟"

"میں نے کچھ غلط کہا؟" وہ فوراً معصوم بن گیا تھا۔

"میرے بھائی کو محبت کے دام میں الجھا تو لیا ہے۔ ویسے میں چاہتا بھی کی تھا۔"

"کیف! ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ میں اس وقت تمہاری بڑی بھابی ہوں۔ میرا اور تمہارا رشتہ بدل چکا ہے۔" میں نے بشکل اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔

"ہماری دوستی کا رشتہ تو ابھی تک قائم دائم ہے۔ دوست ہونے کے ناتے تم میرا ساتھ دو گی۔" وہ اتنے کھردرے لہجے میں بولا تھا کہ میرا دل کانپ کر رہ گیا۔

"کون سی دوستی؟"

"وہ ہی جو میرے تمہارے درمیان تھی۔" وہ چپا چپا کر بولا۔

"تم آخر چاہتے کیا ہو؟" میں اس کے بدلے انداز دیکھ کر ٹھٹھک گئی تھی۔ وہ فحاشی کے رنگ میں بات نہیں کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ گہرا طنزیہ کٹ دار قسم کا تھا۔

"میری ریزہ کی بڑی سستا تھی۔"

"اب کیا ہے نا وائش مندانہ سوال۔ میں بھلا کیا چاہتا ہوں۔" وہ دیر سے مسکرایا تھا اور پھر بولنے لگا۔ اور میرا رنگ کھمبہ کھم فحش ہوتا جا رہا تھا۔



نیا اور بھی میں ان دنوں اپنے حجرے سے باہر نکل آئی تھیں اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دونوں نے گھر لو امور میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اگر میں کپڑے دھونے کے لیے مشین لگاتی تو سی یا نیا فوراً ساتھ دینے کے لیے آ جاتی تھیں۔ اسی طرح اگر میں سامان پکاردی ہوتی تو نیا بہتر دن دھونے کھڑی ہو جاتی۔ آتا گوندھ دیتی۔ حتیٰ کہ روٹی بھی پکا دیتی۔ مجھ لی کی کو یا چٹنی ہو گئی تھی۔ اب وہ صرف سودا سلف لا کر دیتی تھیں۔

"دوسری طرف سی کپڑے استری کرتی۔ مرووں کے الگ رکھتی۔ خواتین کے الگ رکھے جاتے۔ ان

وہ دوسری طرف سی کپڑے استری کرتی۔ مرووں کے الگ رکھتی۔ خواتین کے الگ رکھے جاتے۔ ان

وہ دوسری طرف سی کپڑے استری کرتی۔ مرووں کے الگ رکھتی۔ خواتین کے الگ رکھے جاتے۔ ان

دونوں کی شخصیت میں در آنے والی تبدیلیوں نے فائر اور عون کو بھی چونکا دیا تھا اور وہ ان دونوں کے سدھر جانے کا تمام تر کڑٹ مجھے دیتے تھے۔

اوھر کیف کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ سب گھر والے اس طرح سے میرے گرویدہ ہو جائیں گے۔ لما اور دادی کچھ کتنی تو نہیں تھیں مگر ان کی آنکھوں میں موجود شکر گزاری کے رنگ میری نظروں سے اوجھل نہیں تھے۔

نیا اور سی فیشن سے لے کر اسکن کی کیئر تک ہر مشورہ مجھ سے لینے کے لیے بھائی بھائی ملتی آتی تھیں۔ ان کے خیال میں میرے پاس معلومات کا بہت بڑا خزانہ موجود ہے اور میں بڑے شہر سے آئی تھی سو مجھے ہر فیشن کے بارے میں علم تھا۔ یہ تو نیا اور سی کی سالوں کی محنت حالانکہ مجھے بدلے فیشن کا کچھ پتا نہیں تھا مگر میں غلطی سے مفید مشورے لے کر انہیں معلومات فراہم کرتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دونوں میرے اور بھی قریب آ گئی تھیں۔

ان کا زیادہ وقت اب میرے ساتھ گزرتا تھا۔ مل جل کر محبت چٹ کلام بھی ہو جاتے تھے۔ گھر بھی صاف ستھرا ہو جاتا تھا اور پھر کافی دیر تک شب بھی چلتی رہتی۔ وہ دونوں صرف سونے کے لیے اپنے کمرے میں جاتی تھیں۔ زیادہ تر لاؤن جیس ہی بیٹھی رہتیں۔

اس دن ابھی سی اپنی بیٹی کا مجھ سے پوچھ پوچھ کر فراک سی رہی تھی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھی۔ ایک دم میں نے بیگزین ہاتھ سے رکھ کر کچھ سوچنے ہوئے سی سے پوچھا۔

"بہت دن ہوئے کیف گھر نہیں آیا۔"

"وہ گھر کہاں آتا ہے۔ زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہتا ہے۔" وہ احتیاط سے سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے بولی۔

"مگر کیوں؟" میں حیران ہوئی۔ جب سے میں آئی تھی۔ کیف کا یہی معمول دیکھ رہی تھی۔ تاہم میں نے ایک سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیف کہاں جاتا ہے۔

"مگر کیوں؟" میں حیران ہوئی۔ جب سے میں آئی تھی۔ کیف کا یہی معمول دیکھ رہی تھی۔ تاہم میں نے ایک سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیف کہاں جاتا ہے۔

"مگر کیوں؟" میں حیران ہوئی۔ جب سے میں آئی تھی۔ کیف کا یہی معمول دیکھ رہی تھی۔ تاہم میں نے ایک سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیف کہاں جاتا ہے۔

"مگر کیوں؟" میں حیران ہوئی۔ جب سے میں آئی تھی۔ کیف کا یہی معمول دیکھ رہی تھی۔ تاہم میں نے ایک سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیف کہاں جاتا ہے۔

"مگر کیوں؟" میں حیران ہوئی۔ جب سے میں آئی تھی۔ کیف کا یہی معمول دیکھ رہی تھی۔ تاہم میں نے ایک سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیف کہاں جاتا ہے۔

"چاہ نہیں۔" صاف لگ رہا تھا وہ ٹالنے کی کوشش میں ہے۔

"کیوں چاہ نہیں؟ یہ کو، مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔"

میں نے جذباتی بلیک میلنگ کا سارا ایا تھا اور میری ناراضی کے خیال سے وہ فوراً بول اٹھی۔

"نہیں بھابی! ایسی بات نہیں۔" وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔ "دراصل پہلے ایک بھائی اور کیف کی بھی بی بی نہیں تھی۔ کیف ہر وقت ایک بھائی سے جھگڑتا رہتا تھا اور یہ جھگڑا شدت اختیار کر جاتا تھا۔ بات بات بھائی تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک دفعہ کیف نے فیسے میں ایک بھائی کا سر پھاڑ دیا تھا۔ ایک دفعہ گولی بھی چلا دی تھی۔

مگر یہ کافی سال پرانی بات ہے۔ اب تو اس نے ایک بھائی سے صلہ کر لی ہے۔ پہلے سے کافی بدل گیا ہے۔" وہ رشتہ تو ہر وقت خون سوار رہتا تھا اس کے سر پر۔ پھر جب اس نے بتایا کہ وہ ایک بھائی کے لیے لڑکی پسند کر چکا ہے۔ تو ہم سب حیران رہ گئے اور زیادہ حیرانی اس وقت ہوئی تھی جب ایک بھائی نے اس کی پسند کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔

ان دنوں ہم لوگ ایک بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھ رہے تھے۔ عون کا خیال تھا۔ ایک بھائی کے ساتھ گل مناسب رہے گی مگر کیف کو گل پسند نہیں تھی اور یہ ہماری اور ایک بھائی کی خوش نصیبی تھی کہ آپ ہمیں مل گئیں۔" دراصل پہلے پہل ہمارے ذہن میں تھا کہ آپ بہت مغرور اور تک چڑھی ہوں گی۔ اسی لیے میں اور نا آپ سے ذرا دور دور رہی تھیں مگر آپ تو ہماری سوچوں کے بالکل برعکس تھیں۔

وہ سالوں بھرے لہجے میں بتاتی سی تھی تھی۔

"کیف کا جھگڑا ایک کے ساتھ کس بات پر تھا؟"

میں نے سوچوں کے کھنور سے نکل کر پوچھا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا۔ میرے آنے سے پہلے کی بات ہے۔"

"نیا کو بتا دو گا؟" میں نے سی سے پوچھا۔

"نہیں میرے خیال میں مجملی جاتی ہیں۔"

"نہیں میرے خیال میں مجملی جاتی ہیں۔"

”اب تو ان کے درمیان کوئی لڑائی نہیں؟“ میں اپنی تسلی کے لیے پوچھ رہی تھی۔
 ”نہیں، بالکل بھی نہیں۔ ایک بھائی تو مزاجاً بھی اور دل کے بھی بہت اچھے ہیں۔ کیف چڑبائی اور فتنہ ور ہے۔ تاہم ایک بھائی نے بھی بات نہیں بڑھائی۔“

وہ فراک سی چکی تھی۔ اب سلمان سمیٹ رہی تھی اور میں گہری سوچوں میں ڈوب ابھر رہی تھی۔ دراصل میرا ذہن بری طرح سے الجھ چکا تھا۔
 ”آخر کیف نے مجھے کس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے؟ مجھے ایک کے لیے پسند کرنا۔ حق میں اسنی بھاری جائیداد لکھو اٹا۔“ میرا ذہن ایک نقطے پر آکر ٹھہر چکا تھا۔ ”بہر حال، جو بھی ہے۔ کیف یوم اپنے گھر والوں سے لے کر ایک تنگ سب کو دھوکا دے سکتا تھا مگر مجھے نہیں۔ میں یعنی سادیہ مراد اس کے جال میں کبھی نہیں پھنس سکتی اور میرا یہ خود سے عہد تھا کہ اس ساری پلاننگ کی وجہ آخر جان کر ہی رہوں گی۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور پھر مطمئن ہو گئی۔



اس دن کی بات ہے، جب ایک کام کے سلسلے میں قسمر سے باہر گیا تھا اور ٹھیک اسی شب کیف چلا آیا۔ اس کے انداز آج کافی بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ کوئی فیصلہ کر کے آیا ہے۔ میں اس وقت چن میں تھی اور وہ میرے پیچھے چن میں ہی چلا آیا۔
 ”مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔“ اس کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔ میری چھٹی حس نے فوراً مجھے چونکا دیا۔

”کون سی بات؟“
 ”میرے ساتھ کو۔“ اس کے دھونس بھرے انداز نے مجھے بے حد فصد دلایا تھا مگر میں بھر بھی ضبط کر گئی۔
 ”کمال؟“
 ”بیٹھک میں۔ مجھے تم سے عمالی میں بات کرنا ہے۔“

”جو کہنا ہے۔ یہیں کہہ دو۔“ میں پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا تھا۔ پھر بڑے پرسرار انداز میں بولا۔
 ”میرے ساتھ ایک ڈبل کرو۔“
 ”کیسی ڈبل؟“ اب گے میں جیج ٹھنک گئی تھی۔ بات معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ میرا دل خوف کے مارے سکتے لگا۔

”یہ گھر تمہارے نام ہو چکا ہے اور ایک کی دو فرنیچر بھی۔ تم ان کے کاغذات قانونی طور پر میرے نام کرو۔“ اس نے گویا بڑے اطمینان سے آگ پر پٹول کے جھینے پھینکے تھے۔
 ”کیا مطلب؟“ میں چیخ اٹھی۔

”چلاؤ مت، میری بات آرام سے سنو۔ میں نے یہ تمام کوششیں اسی وجہ سے کی تھیں۔ مجھے ایک کا اور تمہارا اعتماد جیتنا تھا اور پھر اپنا مقصد پورا کرنا تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ پوسا کے ذریعے اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا مگر پھر اپنی زندگی کی چابی اور بڑی خوشی کو کھودینے کے خوف نے مجھے تم تک پہنچا دیا۔ میں پوسا کو ایک کے نکاح میں دے کر کوئی رسک نہیں

لے سکتا تھا۔ حالانکہ پوسا کے ذریعے ایک کی ساری برائی مجھے مل سکتی تھی۔ اب تو صرف اس گھر کی اور دو فرنیچر کی بات ہے۔ بہر حال تم مجھے تمام کاغذات دے دو۔ علاوہ اس منگ کی ذمہ داری تم ہی پر ہوگی۔ میں تمہارے ارد گرد ایک جال بن دوں گا۔ تم اس جال سے نکل نہیں پاؤ گی۔“
 وہ گویا زخمی منہ کی طرح پھٹکا رہا تھا اور میرے قدموں کے نیچے سے زین دھیرے دھیرے سرکنے لگی تھی۔

”تم دھوکے باز ہو کیف! تم نے مجھے ہی نہیں اپنے بھائی کو بھی دھوکا دیا ہے۔ جس کے ساتھ تمہارا خون کا تعلق ہے۔ مجھے افسوس ہے تمہاری گندی فہمیت پر“ لالچ پر ٹیکنیکی دکھانے پر۔
 ”میں گویا غصے کے عالم میں پھٹ پڑی۔“

”کچھ بھی کہہ لو۔ کاغذات تو تمہیں دینے ہی پڑیں گے۔“ اس نے گویا آنکھیں مساتے پر رکھ لی تھیں۔
 ”اور اگر نہ دوں تو؟“

”تو پھر اپنی جانی کے لیے تیار ہو جانا۔ میں ایک کو صاف لنگھوں میں بتا دوں گا کہ تم میری محبت میں گرفتار تھیں اور میرے مجبور کرنے پر تم ایک سے نکاح کرنے پر تیار ہو گئی تھیں مگر ایک کی دولت ہم دونوں ہتھیالیں۔ تمہارے پاس موجود کاغذات تمہاری لالچ کے گواہ ہیں۔ ایک کو مزید یقین دلانے کے لیے میں تمہاری اور اپنی دو سنی کا قصہ بھی سنا دوں گا۔ ایک کو گواہ بھی پیش ہو جائیں گے۔ پھر تم کیا کر سکو گی؟“

وہ گویا استہزائیہ مسکرا رہا تھا۔ میری بے وقوفی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس نے مجھے ہی نہیں ”ایک کے ساتھ بھی دھوکا کیا تھا اور نجلے اس نے مزید کیا کچھ کرنا تھا۔ میرا دل خوف کے مارے پھر بھڑا رہا تھا مگر میں نے خود کو کمزور ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”میں تمہیں بھی بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔ دھوکے باز اور فریبی لوگوں کو ان کے انجام تک پہنچا کر رہوں گی۔ تم نے رشتوں کے تقدس کا بھی خیال نہیں رکھا۔ کیا اتنے

سال کلج اور نوٹورٹی میں بیسی سیکھتے رہے ہو؟“
 ”زیادہ بڑبڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ ورنہ اپنی بھاد ہی کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ کیف نے گویا آخری وار تنگ دی تھی۔

”تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو۔ اگر جائیداد کا کوئی جھگڑا ہے تو ایک سے کوہ اس میں بھلا میرا کیا ضرور ہے۔“ میں گویا تھک کر بولی تھی۔

”اگر وہ آرام سے ملتا جاتا تو پھر مجھے اتنی بڑی پلاننگ کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ ہمارے حق پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اور ہمیں اپنے کاروبار میں تنخواہ دار ملازم رکھنا چاہتا ہے۔ مانی فٹ! اس کی چاکری کرتی ہے میری جوتی۔ اسے ہر صورت مجھے برابر کا حصہ دار بنانا ہو گا ورنہ میں ہر حد سے گزر جاؤں گا۔“ وہ ہانڈ کر بولا۔

”آتم سوری کیف! میں تمہاری بات نہیں مان سکتی۔ مجھے اپنے شوہر کا اعتبار اور مان عزیز ہے۔ میں اس کے اعتماد کا خون نہیں کر سکتی۔“ میرے دو ٹوک فیصلہ کن انداز نے اسے بھڑکا کر رکھ دیا تھا۔ وہ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔

”میں تمہیں ایک کی زندگی سے نکال پیچیکوں گا۔“ وہ غصے کے مارے کف اڑا رہا تھا۔

اور پھر اس نے اپنا کامیج کر دکھایا۔ وہ مجھے ایک کی زندگی سے باہر نکال چکا تھا۔ یہ اسی مان، اعتبار اور اعتماد کو بچانے کا نتیجہ تھا جو میں اپنی ماں کے گھر واپس آ چکی تھی۔ ایک نے کچھ زیادہ تو نہیں کہا تھا مگر اس کے چند الفاظ نے میرے جسم سے گویا جان تک نکال لی تھی۔

”مجھے دکھ ہوا ہے سادیہ! میرا دل اس وقت صدمے کے زیر اثر ہے۔ میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش نہیں آتا چاہتا۔ تم ابھی چلی جاؤ ڈراؤ یا رہا ہر شکر ہے۔ اگر میں اس صدمے اور دکھ کی کیفیت سے سنبھو تا کر کے سنبھل گیا تو تمہیں لینے آ جاؤں گا۔ ورنہ ہمارے راستے جدا ہیں۔ تم وہ کاغذات بھی ساتھ لے جانا۔ میں تنہا دے کر واپس لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

دھیما لوجہ، جھکی آنکھیں اور مضبوطی سرخیوں سے سجا چروہ۔ اس نے نہ وضاحت طلب کی تھی اور نہ ہی مجھے خود سے دور کرنے کی وجہ بتائی۔ مگر میں جان تو چکی تھی کہ کیف کی خود غرضی اور کینگی رنگ لے آئی ہے۔

میں نے اسی شب سلمان باندھا تھا اور غالی دل لیے ایک کے گھر سے نکل آئی۔ اپنے پیچھے داوی، ملاوٹا، سی کو منتظر اور روتا پھوڑ کر مگر پورے ڈیڑھ ہفتے بعد بھلا کیا ہوا؟

”آپ۔“ میں نے پردے برابر کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گویا پھر ہو گئی تھی۔ ایک عین میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ کب دے پاؤں گھرے میں داخل ہوا تھا مجھے

قطعا "خبر نہیں ہو سکی۔ اپنی تلخ اور زہریلی سوجھ بوجھ میں گم گھڑکی کے سامنے کھڑے کھڑے میری باتیں گویا شل ہو کر رہ گئی تھیں۔

"ہاں" میں۔ کیا تمہیں امید نہیں تھی کہ میں واپس آؤں گا۔" وہ یہی مخصوص نرم اور دھیمالہجہ۔ میرے دل کی دھڑکنیں اول روز کی طرح بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

"جس طرح مجھے گھر سے نکالا تھا۔ بھلا کوئی امید باقی رہ گئی تھی کیا؟" تجالے کہاں سے ڈھیروں آنسو میری آنکھوں میں خود بخود اتر آئے تھے۔

"وہ وقت اور لمحے ہی کچھ ایسے تھے ابھی تک اپنے ان الفاظ پر پچھتا رہا ہوں مگر میں بھی بھلا کیا کرتا" کیف نے کہا یہی کچھ اس طرح سے سنائی تھی کہ اس کے حرف حرف پر اعتبار آ گیا۔ تم سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ یہی میری سب سے بڑی بات تھی جس پر ابھی تک پشیمان ہوں۔ جو کچھ وہ بتا رہا تھا، میری طرح کوئی بھی آدمی ان باتوں کے چال میں پھنس سکتا تھا۔" وہ سر جھکائے دھیمی گواہی دے رہا تھا۔

"آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" میں ابھی لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی جب ایک نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

"پلیز سائی! پہلے میری بات سن لو۔ پھر جو کچھ کہو گی" میں سنتا رہوں گا۔ جو سزا سنو گی۔ مجھے منظور ہو گی۔" وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ گویا کہہ دینے یا نہ کہنے کے درمیان الجھ رہا تھا۔ پھر جب بولا تو آواز میں ہمیشہ والا ٹھہراؤ تھا۔

"بات کہاں سے شروع کروں۔ بہت پہلے سے" جب میں چوبدری قیوم کے آگن میں کھیلنے والا پہلا بچہ تھا۔

پورے آٹھ سال تک میں پہلا اور آخری بچہ ہی رہا تھا اس دوران میرا کوئی اور بھائی اس دنیا میں نہیں آیا۔ میرے دادا کے لیے یہ بات خاص تشویش ناک تھی مگر انہوں نے مجھ پر ہی گویا صبر کر لیا تھا۔ ان کی مجھ

سے محبت کوئی دھمکی چھپی نہیں تھی۔ وہ مجھے اپنی زندگی کی واحد خوشی سمجھتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں گوشتے والدین کی اولاد تھا۔ میری ماں اور باپ دونوں قوت گویائی سے محروم تھے۔ میرے لیا، دوا کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کی زمینوں اور کارخانے کے اکلوتے وارث۔

ان کے ہاں، میں پہلا صحت مند بچہ پیدا ہوا تھا۔ میرے دادا کے لیے میری پیدائش بہت اہم کی دولت کے برابر تھی۔ انہوں نے جی بھر کے میرے ناز اٹھائے تھے۔ مجھے بے تحاشا محبت سے نوازا تھا۔ میں ان کی محبت کے حصار میں خود کو ہمیشہ محفوظ سمجھتا تھا مگر یہ حصار تب ٹوٹ کر بھر گیا جب میرے دادا اس دنیا سے چلے گئے مگر جانے سے پہلے وہ اپنی ساری جائیداد میرے ہاتھ کر گئے تھے۔ اور ان کے چل جانے کے بعد، بے بعد و بیکرے میرے چار اور بھائی پیدا ہوئے۔ اور پھر ہمارے ابا معصومیت سے بھاری چلے گئے۔ تب میں کافی سنبھل چکا تھا اور کچھ وقت کی سختیوں نے مجھے اچھی طرح سے سارے سبق پڑھا دیے تھے۔

میں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ کاروبار سنبھال لیا تھا۔ تب کیف بہت ناسمجھ اور نادان تھا اور میری نظر میں تو بالکل بچہ تھا۔ مجھے اپنی ماں اور بھائیوں سے بہت محبت ہے۔ اسی محبت نے مجھ سے بے تحاشا جدوجہد کروائی۔ میں نے اپنے قوت بازو پر، اپنی محنت اور جدوجہد سے اپنا گھر بنایا تھا۔ چار فرخ نماز خریدیں۔ ایک دم سے سارا کچھ نہیں ہو گیا تھا۔ بے تحاشا محنت اور قربانیوں کے بعد میں اپنا ایک باغ بنالیا تھا۔

تب کیف بڑھنے کے لیے ہاسٹل میں مقیم تھا اور ما کی کسی کزن کے گھر بھی اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ انہی کی بیٹی یو ساسا وہ شادی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اس بات سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ مگر وہاں کچھ یوں کہ ہماری رشتے کی اس خالہ نے یعنی یو ساسا کی ماں نے میرے خلاف کیف کے دل میں زہر بھرتا شروع کر دیا تھا۔

وہ چاہتی تھیں کہ کیف اپنے حصے کی جائیداد لے کر ان کے پاس آجائے اور جب میں نے ایمان داری کے ساتھ قانونی طور پر اپنے چاروں بھائیوں کو دوا کی جائیداد کا حصہ دیا تو ہم سب کے حصے میں تھوڑی سی برابری آئی۔ یہی بات ہماری خالہ کو بھرپور کائی تھی۔ ان کی نظر میرے کاروبار پر بھی اور وہ چاہتی تھیں کہ میں اپنے بزنس میں سے بھی کیف کو حصہ دوں۔ ظاہر ہے میں نے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں کیف مجھ سے بدگمان ہو گیا۔ میرے ساتھ جھگڑنا رہا۔ بات خون خرابے تک آ گئی تھی۔ میں کیف کو حصہ دانا بھی لیتا اگرچہ میں خالہ اور ان کی بیٹی نہ ہوتی۔

یہ مسئلہ ضد اور انا کا بن گیا تھا۔ میری اور کیف کی ناراضی چل رہی تھی۔ ایک دن وہ خود میرے پاس چلا آیا۔ اپنی گزشتہ غلطیوں کی معافی مانگتا رہا تھا میں نے بھی کھلے دل سے اسے معاف بھی کر دیا۔ ہمارے پہلے کی طرح تعلقات بحال ہو گئے تھے۔ مجھے نہیں خبر تھی کہ یہ سب ایک سازش اور منصوبے کی کڑی ہے۔

پھر ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ پوچھو کے بزنس میں قیام پذیر ہو چکی ہے۔ خاصی انڈر اسٹینڈنگ رہتا ہے اور ان کی بیٹی کو وہ میرے لیے پسند کر چکا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی عورت ایسی نہیں تھی جو ہمارے اس طرح کے معاملات نمٹاتی۔ فائز اور عون کی شادیوں کے تمام معاملات اسی نے ہی دیکھے تھے۔

اگرچہ فائز اور عون نے نو مہینے کی تھی۔ دوران تعلیم ہی دونوں پر شادی کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ہر حال جو بھی تھا، احسن طریقے سے ان کی شادیاں ہو گئی تھیں۔

اما کی ساری ذمہ داریاں کیف نے ہی اٹھائیں۔ اوھر کیف نے مجھے جو کچھ تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے لگا تم میرے آئیڈیل کا ایک حصہ ہو۔ میرے دل نے تمہارے حق میں فیصلہ دے دیا تھا اور میں بغیر دیکھے ہی تمہاری سادگی اور معصومیت کا اسیر ہو گیا۔

میں جانتا تھا کہ ہماری ماں ایسے معاملات نہیں دیکھ

سکتی۔ جو کچھ کرنا تھا، کیف نے ہی کرنا تھا اور وہ اپنی پلاننگ کے تحت سب کچھ کرنا اور میں اپنی سادہ دلی میں اس سے بیحد دھوکا کھاتا رہا۔

شادی کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات کے لیے جب رقم کم پڑ گئی تو وہ دوبارہ مجھ سے پیسوں کا مطالبہ کرنے لگا۔ اگر مجھے سمجھتا ہوتا تو میں تب ہی سمجھ جاتا کہ میں نے شک اور بدگمانی کو کسی دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ پھر حق مرے طور پر اتنی بھاری جائیداد پر کیف کی ضد اور اصرار۔ میں حیران ضرور ہوا تھا مگر چونکا پھر بھی نہیں۔ میں نا افسانگی میں وہ ہی سب کچھ کرنا پڑا جو وہ مجھ سے کروانا چاہتا تھا۔

میرے لیے سب سے بڑا انعام تم تھیں ساجید! ایسا انعام جو مجھے کیف کے توسط سے ملا۔ میں تمہاری سادگی اور معصومیت کا اسیر ہو گیا تھا۔ مجھے تم سے اور تمہارے خاص جذبوں سے بھرے دل سے محبت ہو گئی تھی۔ تب کیف نے سوچا کہ بازی ابھی جاری ہے اور وہ اس بازی کو اپنے حق میں کرنے کے لیے بے صبری کا مظاہرہ کر گیا یعنی تمہارے ساتھ وہ دو گفتگو کر کے ایسی گفتگو جو کسی نے من و عن سن لی تھی اور پھر مجھے بھی سنائی۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگ اپنے زرخیز دماغ کو لوگوں کے گھر اور دل اجاڑنے کے لیے کیسے استعمال کر لیتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ میرے دل میں شک کی آگ جلا کر خود اپنے دل کو آباد کر کے کیا تھا مگر ہماری ملاجی اور خود غرض خالہ نے کل رات یو ساسا کو ایک کروڑ پتی سیٹھ سے بیاہ دیا اور کیف قیوم کے دل پر گویا شام فریب اتر آئی۔ اس صدمے میں وہ ہانپنے سے مگر اگر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ اوھر آنے میں اسی لیے دیر ہو گئی تھی کہ مجھے اس کے پیچھے ہسپتال جانا پڑا۔

دیکھو سمانی! انجزم تو وہ ہم دونوں کا ہے مگر میں نے اسے تمہاری طرف سے بھی معاف کر دیا ہے۔ کیا کروں، میری قوت گویائی سے محروم ماں، بول نہیں

سکتی، مجھے علم نہیں دے سکتی۔ مگر اس کی آنکھوں کی
الٹا کو لوٹا دیتا میرے بس میں نہیں ہے اور میری ماں کی
خواہش ہے کہ جب میں واپس آؤں تو تم بھی میرے
ساتھ ہو۔ کیا تم میری ماں کی خواہش پوری کرو گی؟

وہ آنکھوں میں اس کے دیے سجائے شہر کھڑا
تھا۔ میری ایک ماں نے اس کے چہرے کو تباہی بخش
دیا تھی۔ مگر میں بھی پورے ایک ہفتے کی ناراضی کا
حساب لے بغیر اسے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اگرچہ
ایک مجرم نہیں تھا۔ مجرم تو وہ تھا، بولاچ میں اور یوسا
کے حصول کی خاطر خون کے رشتوں کو بھو دینے والا
تھا۔ اب اس مجرم کو بھلا اور کیا سزا دی جانی تھی۔

بے چارہ دل تروانے کے ساتھ ساتھ ٹانگ بھی تڑوا چکا
تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے اپنی قسطی کا
احساس ہو گیا تھا۔ وہ پشیمان تھا، شرمندہ تھا۔ سو میں
نے سوچا تھا کہ ایک پشیمان کو بھلا اور پشیمان نہ ہی کیا
جائے تو بہتر ہے۔

مگر ایک کو ستانے کا میں پورا پورا ارادہ رکھتی تھی۔
سو اسی لیے خود ناراضی کا خون چڑھائے بولی۔

”میں آپ کو معاف نہیں کر سکتی ایک! آپ
واپس چلے جائیں۔ میں اپنی انسلٹ نہیں بھول سکتی۔
آپ نے بغیر وضاحت لیے مجھے گھر سے کیوں نکالا؟“

”مجھے معاف کرو۔ ساتی! میں واقعی شرمندہ
ہوں۔“ ایک میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر گھبرا
اٹھا۔ وہ ہر صورت مجھے منانا چاہتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ
ایک کو منانا آسانی کہاں تھا اور ابھی وہ اسی سوچ میں گم
تھا کہ مجھے کیسے منائے کہ اچانک دھاڑ سے دروازہ کھلا
اور سہی اور نیا کمرے میں داخل ہو کر مجھ سے لپٹ
گئیں۔

”ہم آپ کو زبردستی افکار لے جائیں گے بھابھی!
اللہ کی قسم“ آپ کے بغیر پورا گھر ویران ہو گیا ہے۔“

سہی اور نیا بھرائی تو آواز میں کہہ رہی تھیں۔ میں نے
ان دونوں کی بے لوث محبت کو محسوس کرتے ہوئے
ایک کو دیکھا تو وہ معصوم صورت بنا کر بولا۔

”اللہ کی قسم! میرا دل اور کمرابھی ویران ہے۔“
میری نظر ایک کے چہرے سے ہٹ کر ایک اور چہرے
سے اٹھ گئی تھی۔ یہ چہرہ لاکاچو تھا مگر میں جانتی تھی کہ
یہ خاموش آنکھیں اور اداس چہرہ کیا الٹا کر رہا ہے۔
مجھے اس لمحے لوٹ کر اس عورت کی خاموشی پر پیار آ گیا
تھا۔

کچھ لوگ اس خاموشی کو برا سراہت سمجھتے تھے مگر
میں جانتی تھی یہ برا سراہت نہیں۔ اس خاموشی میں
ایک کی ماں کا بھرم پوشیدہ ہے۔ آج بھی میرے گھر
والے اس حقیقت سے متواقف تھے۔ کوئی بھی نہیں
جانتا تھا کہ سفینہ بیگم کیوں خاموش رہتی ہیں اور نہ ہی
میں نے کسی کو بتانے کی کوشش کی تھی کہ ملا خاموش
کیوں ہیں۔ وہ قوت کو بیانی سے محروم ہیں۔

میری سوچتی ہوئی نظر نے اس لمحے ایک مرتبہ پھر ملا
کے پاکیزہ چہرے کا طواف کیا تو ان کے چہرے کی الٹا
میرے دل پر گویا جا گئی۔

”ساتی! چلو نا، میرا گھر اور میرے بچے کا دل بچ بچ
تمہارے بغیر ویران ہے۔“

میرے دل کو ایک دم کچھ ہونے لگا تھا اور میں
بھاگ کر ملا سے لپٹ گئی۔ بدگمانی کے بادل چٹکت چکے
تھے۔ دلوں پر جمی گرد و صاف ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے
گھر والوں اور ایک کے گھر والوں کے چہرے پر چمکتی
خوشی کو دل سے محسوس کیا تھا اور گویا گل کر مسکرا
دی۔

کالے ”اودے“ سر مٹی، سیاہ بالوں کے پیچھے کا منظر
— خود بخود صاف ہو گیا تھا۔ اب ستاروں سے بھرا
آسمان میرے سامنے تھا، اور میں نے کمکشائوں کی
بارات کو اپنے گھر میں اترتے دیکھا اور مسکرائے لگی۔

